سبق سبق کہانی

حمیدہ شاہ اختر

سبق سبق کہانی

حمیدہ شاہ اختر
سابق پرنسپل ہائر سکینڈری

نام کتاب: سبق سبق کہانی

مصنفہ: حمیدہ شاہ اختر

صنف: کہانیاں اور نظمیں زبان:: اُردو

اشاعت اوّل: ۲۰۱۴ء تعداد: ۵۰۰

قیمت مُجلد: RS 300/-

سرورق: عادل مختار

طباعت: المختار پبلی کیشنز، اسلام آباد کشمیر

ملنے کا پتہ:

پراگاش بک سینٹر، گوری وان غرب، بجبہاڑا

المختار پبلی کیشنز نئی بستی اسلام آباد کشمیر

مراز ادبی سنگم، بجبہاڑا

اس کتاب کی طباعت کیلئے جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگوئجز سے مالی امداد حاصل کی گئ ہے۔اس کتاب میں ظاہر کی گئی آرا سے کلچرل اکیڈمی کا بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں اور نہ اس ضمن میں کلچرل اکیڈمی پر کوئی ذمہ داری عائد ہوگی۔

☆☆☆

کھانیاں

☆☆☆

☆☆☆

نظمیں

☆☆☆

اِنتساب

صالح

ابدال

اور

جُنیا

کے نام

حمیدہ شاہ اختر

کبھی کبھی مجھے یوں بھی اذاں بُلاتی ہے
شریر بچّے کو جس طرح ماں بُلاتی ہے

منوّر رانا

تقریظ

گذشتہ ایک صدی سے جموں وکشمیر میں اردو اور کشمیری زبان وادب کی خدمت، اشاعت، ترسیل اور تشہیر کے حوالے سے مختلف سطحوں اور دائروں میں مرد اور خواتین نثرونگار، شاعروں اور صحافیوں نے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ کسی نے شعروسخن کے لولوئے لالا سے اس کا دامن بھر دیا اور انشایئے تحریر کر کے ان زبانوں کے ادبی سرمایے میں گراں قدر اضافہ کیا۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور جب تک محبّانِ اردو اور وارفتگانِ کشمیری زبان موجود ہیں، یہ عمل قایم رہے گا، اور جدید علوم کی تیز ترقی کے باوصف اردو شعروادب کے شیدائی اپنا حصّہ ادا کرتے رہیں گے۔

کشمیر میں طبقہ نسواں میں چند خواتین گہری دلچسپی کے ساتھ اردو اور کشمیری ادب سے جُڑی ہوئی ہیں، چنانچہ ان میں رخسانہ جبین، ترنم ریاض، نسرین نقاش

اورڈاکٹر محفوظہ جان کے علاوہ اور بھی قابل قدر نام ہیں، جو شب وروز علم وادب اور درس وتدریس کے ساتھ مربوط ہیں۔ محترمہ حمیدہ شاہ اختؔر تاریخی قصبہ بجبہاڑہ سے متصل ایک گاؤں واگہامہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ حمیدہ جی چند سال پہلے شعبہ تعلیم میں بحثیت پرنسپل کے سبکدوش ہوئی ہیں لیکن سبکدوشی کے فوراًبعد اپنے ہی علاقے میں ایک اسکول قائم کیا اور اس مقدس پیشے کے ساتھ منسلک رہی۔ جس میں انہوں نے تیس سال سے زائد عرصے تک جنوبی کشمیر میں ایک نام پیدا کیا۔ محترمہ چند دن پہلے اپنا مجموعۂ مضامین لیکر راقم کے گھر تشریف لائیں، اور میں ان کی سنجیدہ علمی گفتگو، شوقِ مطالعہ اور درس وتدریس سے متعلق ان کے تجربات اور مشاہدات سے محظوظ ہوا۔

حمیدہ شاہ اختؔر صاحبہ اصل میں تاریخ کی مُدرسہ ہیں۔ لیکن انہوں نے جس کتاب کا مسودہ مجھے دکھایا اور اس پر چند تعارفی کلمات تحریر کرنے کیلئے کہا، یقیناً مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ بچوں، پھولوں، رنگوں اور رعنائیوں سے پیار کرنے والی یہ خاتون "سبق سبق کہانی" کے زیرعنوان کتاب تحریر کرکے اپنی خداداد صلاحیتوں اور زبان وبیان پر کامل دستگاہ کا بھرپور مظاہرہ کر چکی ہیں۔ مجموعۂ مضامین بچوں کی اخلاقی تربیت اور انہیں احساسِ ذمّہ داری دلانے اور مستقبل میں قوم وملّت کے لئے نفع بخش ثابت ہونے کے سرمایے سے آراستہ ہے۔ مضامین کا لب ولہجہ اور

عبارت نہایت سلیس اور سہل الفہم ہے۔ وہ کہانیوں، تمثیلوں اور حکایتوں کے توسّط سے ثمر بار نتائج اور لطیف نکات پیدا کرتی ہیں۔ مضامین کے بین السطور محترمہ حمیدہ شاہ صاحبہ کا اپنے تدریسی تجربے کا اظہار بھی ہو رہا ہے۔

توقع ہے کہ یہ کتاب منظرِ عام پر آکر بچوں کے حوالے سے تحریر شدہ ادب میں قبول، عام اور بقائے دوام کا مقام حاصل کرے گی۔

پروفیسر بشیر احمد نحوی
ڈین فیکلٹی آف آرٹس
کشمیر یونیورسٹی

تاریخ ۱۹ فروری ۲۰۱۴ء

اپنی بات

زندگی میں مجھے جن باتوں سے لگاؤ رہا ہے اُن میں پھول اور بچّے بہت اہمیت رکھتے ہیں ۔ پھول کوئی بھی ہو کسی بھی رنگ کا ہو میرے لئے باعث کشش ہے۔ پھول کو دیکھنا، پسند کرنا۔ ہلکے سے چھو لینا۔ ان سے ان کہی باتیں سرگوشی میں کہنا مجھے بہت پسند ہے۔ اسی طرح میری سماجی زندگی میں بچّے میری کمزوری ہیں۔ بچّے کسی کے بھی ہوں، کسی کی گود میں ہوں۔ میں اُن کی طرف متوجہ ہو جاتی ہوں اور وہ میری طرف کھنچے چلے آتے ہے۔ اُن کو پیار کرنا اور اُن کے ساتھ کھیلنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ میرے خاندان کے سبھی بچّے مجھ سے اور میں اُن سے بے پناہ پیار کرتی ہوں ۔ بہت بار ایسا ہوا ہے کہ بچّوں کو مشغول رکھنے کے لئے میں اُنہیں کبھی اچھی کہانیاں سناتی تھی تو کبھی پیاری پیاری سی نظمیں۔ یہ سب کہانیاں اور نظمیں میں نے کہیں پڑھی یا سُنی ہوتی تھیں۔ میرا یہی شوق مجھے بچوں کے لئے لکھنے پر اُکساتا رہا اور یوں زیرِ نظر کتاب ''سبق سبق کہانی'' منصۂ شہود پہ آ گئی۔

میں اپنے کشمیری شعری مجموعے ''اندرِم سفر'' اور اُردو شعری مجموعے ''خوابوں کے گُل پیکر'' سے پہلے یہ کتاب چھپوانا چاہتی تھی لیکن جموں کشمیر کلچرل اکادمی ادارے نے اس کتاب کے مسودے کو ڈیڑھ سال تک اپنے پاس رکھا اور بن پڑھے واپس کر دیا......کیوں..............واللہ العالم

اس کتاب کی کچھ کہانیاں میرے مشاہدے کی بنا پر اور کچھ حقیقی واقعات سے متاثر ہو کر تھوڑے سے ردو بدل کے بعد لکھی گئی ہیں آج کل کے کمپیوٹرائزڈ اور ٹی وی کے دور میں بھی بچے کہانیاں سننا اور متحرک تصاویر کے حوالے سے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ یہ بات میں نے اپنے گھر میں بچوں کی دلچسپی دیکھ کر محسوس کی ہے۔ بچوں کا کہانی کی دنیا سے اپنا ایک پرانا، دلچسپ ناطہ ہے۔ کہانیاں اُن کے خوابوں کی امین ہیں۔ کہانیاں اُنہیں تھپکی دے کر سُلاتی ہے۔ اُن کے اپنی کہکشاں اُن کا اپنا چاند اور اُن کے خیالوں کی اپنی حسین دنیا آباد کرنے میں اپنا ایک اہم کردار ادا کرتی ہیں بشرطیکہ کہانیوں میں اخلاقی، علمی، ادبی، سماجی اور معاشرتی لحاظ سے ایک قابل غور مواد موجود ہو......میں اس ''سبق سبق کہانی'' کے اوراق میں بچوں کی وہی دنیا بسانا چاہتی ہوں۔ یا یوں کہیے بچوں کی اُسی حسین اور معصوم دنیا میں ان کہانیوں کو ایک اہم کردار ادا کرتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں۔

اُردو پورے برصغیر کی زبان ہے اور اب یہ عالمی پیمانے پر بھی جانی پہچانی اور بولی جاتی ہے اس لئے میں نے ان کہانیوں نظموں کے لئے اسی زبان کا سہارا لیا ہے تاکہ وادی کے ساتھ ساتھ پورے برصغیر کے بچے اس کتاب کو پڑھ سکیں۔ خدا کرے یہ کہانیاں اُن کی کردار سازی میں اپنا رول ادا کریں۔

''سبق سبق کہانی'' کی طباعت واشاعت کے مراحل طے کرنے میں مجھے جن اصحاب کی رہنمائی حاصل ہوئی اُس میں سب سے پہلے میرے سرتاج جناب سکندر صاحب ہیں جو ہمیشہ میری تحریروں کو سراہتے رہے ہیں اور اُن کی یہی حوصلہ افزائی میرے لئے مشعل راہ بنی ہے۔ میں محترم اُستاد جناب پروفیسر شاد صاحب، عزیز برادر اظہار مُبشر اور برادر محترم زاہد مختار کی مشکور ہوں جنہوں نے میری اس کتاب کی طباعت میں اپنا اہم کردار نبھایا۔

میں ''سبق سبق کہانی'' کو آپ تک پہنچانے اور اسے دلچسپ اور معیاری بنانے میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہوں یہ سب آپ جیسے محترم ومدّبر قارئین کرام کی آرا پہ منحصر ہے۔ خدا سب بچّوں کو اپنی حفاظت میں رکھے۔

حمیدہ شاہ اختر

سابق پرنسپل ہائر سیکنڈری

کہانیاں

جب اُس کی نوازش ہوتی ہے، یہ معجزہ تب ہو جاتا ہے
الفاظ مہکنے لگتے ہیں ، کاغذ بھی ادب ہو جاتا ہے
بشیر بدر

نیک ہمسائے

ایک تیتیا ہمیشہ ایک شہد کے چھتے کے سامنے آتی تھی ۔شہد کی مکھیاں خوف کے مارے تھرتھراتی تھیں ۔اور اُنکی اسی تھرتھراہٹ اور گھبراہٹ کا فائدہ اُٹھا کر کچھ مکھیوں کو پکڑ مارتی اور اپنے بچوں کو کھلانے لے جاتی ۔اسی طرح وہ دن میں کئی پھیرے لگاتی ۔اور شہد کی مکھیوں کو مار کر لے جاتی ، یوں شہد کے چھتے میں مکھیوں کی تعداد کم ہونے لگی ۔اور شہد بننے پر اثر پڑنے لگا۔شہد کی مکھیاں پریشان تھیں ۔ایک طرف اُن کی دُشمن تیتیا مضبوط تھی اور دوسری طرف شہد کی مکھیاں کمزور۔اگر وہ مل کر مقابلہ کرتیں تو شاید تیتیے کو مار گراتی ۔لیکن ایسا کر کے اُنکا ہی نقصان ہو جاتا۔کیونکہ جو شہد کی مکھی اپنا ڈنک مارنے کا کانٹا کسی پر استعمال کرتی ہیں ۔وہ پھر چھتے کیلئے بیکار ہو جاتی ہیں ۔وہ حیران اور پریشان تھیں کہ کیا کیا جائے ۔کس طرح اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کیا جائے ۔

شہد کے چھتے کے قریب ہی ایک فاختہ نے چھت کی کڑیوں میں اپنا گھونسلہ بنایا تھا۔ یہ مہینہ اپریل کا تھا۔ فاختہ نے انڈے دئے تھے اور وہ اپنے گھونسلے میں انڈوں کو سی رہی تھی ۔فاختہ اور شہد کی مکھیوں کو چھتے کے سوراخ سے

نکلتے دیکھتی۔ پھر مکھیاں پھولوں کا رس لیکر واپس اپنے چھتے میں آکر وہاں پہ رس جمع کرتی رہتی تھیں۔

ایک دن اُسے شہد کے چھتے سے مکھیوں کی کچھ بھنبھناہٹ سُنائی دی۔ یہ بھنبھناہٹ کچھ عجیب سی تھی۔ شہد کی مکھیاں چھتے کے سوراخ کے ارد گرد بیٹھی تھیں۔ اور بیچ بیچ میں اپنے پر کچھ اس طرح پھڑ پھڑاتی کہ عجیب سی آواز نکلتی۔ فاختہ دیکھتی رہی۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ تبھی اُس نے دیکھا کہ دو تیتے چھتے کے سوراخ کے قریب منڈلا رہے تھے۔ جونہی وہ مکھیوں کے قریب جاتے۔ شہد کی مکھیاں اپنے پر ایک ساتھ پھڑ پھڑاتیں اور یہ بھنبھناہٹ پیدا ہو جاتی۔ دو تین بار تیتے منڈلانے کے بعد کسی نہ کسی شہد کی مکھی کو مار گراتے اور اُسے لیکر غائب ہو جاتے۔ فاختہ پریشان ہوگئی۔ اُسکو خیال آیا کہ تیتے گوشت خور ہیں۔ انکو کہیں مُردار نہ ملا ہوگا اور وہ شہد کی مکھیوں کو کھانے آگئے۔ کل کو میرے انڈوں سے بچے نکل آئینگے۔ بالکل گوشت کے لوتھڑے۔ تیتے اُنکو بھی ڈنک مار کر مار ڈالینگے اور کھا جائینگے۔ اُسے اپنے ہمسائے شہد کی مکھیوں پر ترس آگیا۔ اُس نے سوچا کہ اس وقت ان بے بس شہد کی مکھیوں کی مدد کرنا میرا فرض بنتا ہے۔ کیونکہ میں اس معاملے میں ان سے زیادہ طاقت ور ہُوں۔ اور مکھیوں کی مدد کرنے کی صلاحیت اور طاقت رکھتی ہُوں۔ اور انکی مدد کر کے میں اپنی بھی مدد کروں گی۔

فاختہ ایک دم اُٹھی اور جھپٹا مارا۔ ایک تیتےّ کو اپنی چونچ میں پکڑ کر مسل ڈالا۔ پھر وہ بار بار لپکی۔ ہر بار اُس نے اُن تیتوں کو چونچ میں پکڑ کر مار ڈالا جو چھتے کے آس پاس منڈلانے آتے تھے۔ اسطرح شہد کی مکھیوں کے خطرناک دُشمنوں کو ختم کر ڈالا۔ اور اب اُسکا روز کا معمول بن گیا۔ کہ وہ شہد کی مکھیوں کو تیتوّں سے بچاتی رہتی تھی۔ شہد کی مکھیاں سمجھ گئیں کہ فاختہ نہ صرف اُنکی نیک ہمسایہ ہے۔ بلکہ سچی دوست بھی ہے۔ جو مصیبت کے وقت اُنکی مدد کیلئے آگے آئی۔ وہ دل ہی دل میں اُسکی بڑی عزت کرتی تھیں۔

کچھ دنوں کے بعد فاختہ کے انڈوں سے بچے نکل آئے۔ بالکل گوشت کے لوتھڑے نہ پر نہ آنکھیں۔ بس اک چونچ جو ہر آہٹ پر کھُلتی۔ فاختہ دن میں ہزاروں پھیرے لگاتی۔ اور کیڑے مکوڑے۔ اناج کے دانے لا کر اُنکو کھلاتی رہتی۔ کچھ دنوں کے بعد بچوں نے آنکھیں کھولیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ اُنکے پر نکلنے شروع ہو گئے۔ لیکن ابھی اُڑنے کے قابل نہیں تھے۔

ایک دن کیا ہوا۔ کہ ایک بلّی اسی چھت پر دکھائی دی۔ جہاں شہد کا چھتّہ اور فاختہ کا گھونسلہ تھا۔ فاختہ نے بلّی کو دیکھا اور اُسے گھونسلے کی طرف آتے دیکھا۔ وہ سمجھ گئی کہ اب بچّوں کی خیر نہیں۔ لیکن بیچاری کر بھی کیا سکتی تھی۔ اسکی مدد کیلئے کون آسکتا تھا۔ بلّی آگے بڑھتی رہی۔ اور فاختہ پریشان نظروں سے بلّی کو دیکھتی

رہی ۔ اور خود اپنے گھونسلے کے گرد پھڑ پھڑاتی رہی ۔ اسکے پھڑ پھڑانے کا انداز اتناز بردست اور درد بھرا تھا۔ کہ شہد کی مکھیاں محسوس کئے بنانہ رہ سکیں ۔رانی مکھی نے اپنے کارندوں کو حالات کا جائزہ لینے بھیجا اُنہوں نے واپس آکر کہا کہ فاختہ بیچاری پر مصیبت بن کر بلّی آئی ہے۔ جو اُسکے بچّوں کو نگل جائیگی ، رانی مکھی نے اپنے وزیروں سے مشورہ کیا۔ پھر فوجی مکھیوں کو حکم دیا کہ ایک ساتھ اُٹھو اور بلّی پر حملہ کردو۔ اور فاختہ کو اس مصیبت سے نجات دِلاو۔

سپاہی مکھیاں ایک بڑی بھنبھناہٹ کیساتھ نکلیں اور بلّی پر ٹوٹ پڑیں۔ کسی نے بلی کی آنکھ۔ کسی نے کان ۔کسی نے ناک ۔غرض جسم کے ہر حصّے پر بیٹھ کر ڈنک مارے بلّی اس اچانک حملے سے بوکھلا گئی ۔ اور درد کے مارے تڑپنے لگی اور اپنا توازن کھوبیٹھی اور اونچی چھت سے گر کر نیچے صحن میں پتھروں پر گرِ کر ہلاک ہوگئی۔ اسطرح فاختہ کے بچے بچ گئے ۔ اور فاختہ تشکر بھری نظروں سے شہد کی مکھیوں کو دِیکھتی رہی۔ اور سوچتی رہی کہ کسطرح اپنے ہمسایوں کیلیئے اپنی نیک خدمات حاضر رکھنے سے اپنا ہی فایدہ ہوتا ہے۔

☆☆

نورہ چاچی کی گائے

پورے گاوں میں نورہ چاچی کی گائے کے چرچے تھے ۔ کہ گائے کیا سدھائی ہوئی ہے۔دُودھ زیادہ دیتی ہے۔صحت مند ہے۔گھر سے کبھی بھاگنے کی کوشش نہیں کرتی ہے۔اگر چرنے جائے بھی تو اپنے وقت پر خود ہی واپس گھر آتی ہے۔گھر والوں سے بہت مانوس ہے۔بچوں کو ستاتی نہیں ہے۔آج تک نہ کسی کو سینگ مارا اور نہ لات ۔وغیرہ وغیرہ۔

مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان سب باتوں کے پیچھے کیا راز تھا۔اصل میں نورہ چاچی گائے کو بہت پیار سے پالتی تھی۔اُس کیلئے خود گھاس لے کر آتی۔اُسے کھلاتی۔اُسے خود ہی بھوسہ، کھلی وغیرہ کھلاتی۔جب گائے گھاس چارہ کھاتی رہتی چاچی اُسکے پاس بیٹھتی۔ہاتھ پھیرتی رہتی اور اس سے باتیں کرتی رہتی۔

''کھاو میری رانی میں نے اپنے کھیت سے خود تیرے لئے گھاس لائی ہے۔کتنی نرم نرم اور ہری ہری ہے۔بالکل تیرے پسند کی ہے۔تم یہ گھاس کھاؤ گی ۔موٹی تازی ہو جاوگی ۔دُودھ زیادہ آئے گا۔ہم بھی پیئیں گے تمہارا بچہ بھی موٹا

تازہ اور صحت مند ہو جائیگا۔"

گائے گھاس کھاتی جاتی۔ دُم ہلاتی جاتی اور کان اسطرح ہلاتی گویا نورہ چاچی کی باتیں سنتی رہتی ہو۔ اسی طرح بھوسے میں کھلی اور چاولوں کی مانڈ ملاتے وقت نورہ چاچی اپنے ہاتھوں سے ملاتی اور محسوس کرتی کہ کہیں گرم تو نہیں۔ کہیں اسمیں کوئی مُضر شے تو نہیں۔

نورہ چاچی ناند کو بالکل صاف سُتھرا رکھتی۔ چرنی صاف رکھتی۔ گرمی ہو یا سردی نورہ چاچی گاؤ خانہ اتنا صاف ستھرا رکھتی کہ وہاں آدمیوں کے بسنے کا گمان ہوتا تھا۔ جب نورہ چاچی رات کے وقت گائے کو چارہ ڈالنے جاتی۔ تو گھاس کا بڑا سا پولا اُٹھا کر اُس کو تہہ دار بناتی۔ ہاتھ میں لیکر اپنی گائے کو سر سے لیکر دُم کی آخری نوک تک کھجاتی رہتی۔ گائے چاچی کے اشاروں پر چلتی۔ چاچی کہتی ٹانگ اوپر کرلو میں نیچے کھجالوں، گائے ایکدم ٹانگ اوپر کرلیتی۔ "گردن ادھر موڑلو" گائے گردن موڑلیتی۔ اسطرح گائے اور چاچی کے درمیان بڑا پیارا رشتہ تھا۔ بالکل دو دوستوں کی طرح۔ وہ ایک دوسرے کے احساسات کا احترام کرتیں۔ بڑی دیر تک گائے کے ساتھ یہ پیار بھری باتیں کرنے کے بعد جب چاچی گاؤخانے سے نکلتی تو نکلتے نکلتے گائے کو ہدایت دے جاتی۔ "چارہ چرنے کے بعد آرام کرنا۔ خیال رکھنا تھنوں کو گوبر سے گندہ نہ کرنا۔ اب میں جاتی ہوں۔ خُدا حافظ۔"

اسی طرح گائے کو جب دوسرا بچہ ہونے والا ہوتا۔ تو اُن دنوں اُسکا دُودھ کم ہوجاتا۔ چاچی ان دنوں گائے کا بہت زیادہ خیال رکھتی۔ خوراک میں اضافہ کرتی۔ ہری گھاس زیادہ کھلاتی۔ تاکہ گائے اور بچہ دونوں صحت مند رہیں۔ اور پھر گائے سے کہتی۔ ''بی گائے مجھے معلوم ہے۔ اب تیرا بچہ ہونے والا ہے۔ اور تمہارا دُودھ کم ہوگیا ہے۔ مگر یہ بھی تو خیال کرو۔ انور کے بچے بغیر دُودھ کے چائے کیسے پیئیں گے۔ کم از کم چائے کیلئے دُودھ تو دے دینا۔'' اور گائے جیسے سب سمجھ جاتی اور واقعی زیادہ نہیں تو اتنا دودھ دیتی جو دو وقت کی چائے اور بچوں کیلئے کافی ہوتا۔ اور گھر والوں کو پریشان نہیں ہونا پڑتا تھا۔

انور نورہ چاچی کا بیٹا تھا۔ اور اُسکی بیوی اپنے اور اپنے دو بچوں کیلئے دُودھ اپنی مرضی اور عیش کے ساتھ استعمال کرتی۔ لیکن نہ کبھی بیٹے اور نہ بہو کو گائے کا خیال آتا۔ کبھی بھی اُنہوں نے گائے کے سامنے نہ گھاس ڈالا۔ اور نہ اُسکا خیال کیا۔ یہ سب نورہ چاچی کی ذمہ داری تھی۔ بلکہ کئی بار جب چاچی نے بہو سے کہا بھی کہ بہو دُودھ آرام سے اور مرضی سے پی لیتے ہو۔ کبھی کبھار گائے کا بھی خیال رکھا کرو۔ میں بوڑھی جان کیا کچھ کرتی رہوں گی۔ جواب میں بہو کہا کرتی۔

''اے بڑھیا۔ یہی ایک کام تو کرتی ہو۔ باقی مُفت کی روٹیاں ہی توڑتی رہتی ہو۔ یہ بھی نہ کروگی تو کھاؤگی کہاں سے۔''

چاچی کا دل بہت کڑھتا۔لیکن وہ کسی سے شکایت نہ کرتی۔لے دے کے دل کا غُبار پھر گائے کے سامنے جاکر باتیں کر کے نکالتی۔

''بہو بے وقوف ہے۔سارا دُودھ اپنے اور اپنے بچوں کیلئے رکھتی ہے۔کبھی میرے لئے لسی کا ایک گلاس تک نہیں رکھتی۔''

اسی طرح دن گزرتے رہے۔نورہ چاچی کی بہو چاچی سے لڑتی رہتی۔اور مُفت کی روٹیاں توڑنے کا طعنہ دیتی رہتی۔انور یہ سب دیکھتا رہتا۔لیکن بیوی کے سامنے زبان نہ کھولتا۔پھر ایک دن جھگڑا طول پکڑ گیا۔اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بہو نے چاچی کو گھر سے نکال دیا۔چاچی روتی پیٹتی رہی۔لیکن بہو ٹس سے مس نہ ہوئی۔شور سُن کر پڑوسی اور کچھ رشتے دار بھی جائے موقعہ پر پہنچ گئے۔ہر ایک نے سمجھانا چاہا۔لیکن جھگڑالو بہو نے کسی کی نہ سُنی ۔اور خود گھر چھوڑنے کیلئے تیار ہوگئی۔

نورہ چاچی نے اس وقت بھی صبر اور حوصلے سے کام لیا۔اُس نے سوچا اگر میں گھر سے نکلوں گی تو اکیلی جان ہوں۔اگر بہو نکل جائے گی۔تو نہ صرف انور بلکہ اسکے دو بچے بھی پریشان ہو جائینگے۔لہذا میرا نکلنا ہی بہتر ہے۔تھوڑے دنوں کے بعد سب کی عقل ٹھکانے آجائے گی۔اور بے وقوف میری اہمیت کو سمجھ لینگے۔پھر سب کچھ اپنے آپ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔چاچی کے جیٹھ کے لڑکے اکرم نے

انور اور اُسکی بیوی کو آڑے ہاتھوں لیا۔ بہت لعنت ملامت کی۔ اور چاچی کو اپنے گھر چلنے پر راضی کر لیا۔

جانے سے پہلے نورہ چاچی آخری بار اپنی دوست گائے کے پاس گئی۔ گویا اُس سے رخصت لینا چاہتی ہو۔ اُس نے گائے کو بتا دیا۔ ''تم اب میرے بغیر رہنا سیکھ لو۔ جو کھلائیں کھا لینا۔ دُودھ میں کمی نہ کرنا۔'' آخری بار ہاتھ پھیر کر چاچی گاوخانے سے نکلی۔ اُس شام جب بہو گاوخانے میں دُودھ دھونے گئی۔ تو گائے کو عجیب سا لگا۔ وہ بہو کے ہاتھوں کے لمس سے واقف نہ تھی۔ بہر حال نورہ چاچی کی نصیحت کا اثر تھا یا کچھ اور۔ اُس نے دودھ تو دے دیا۔ لیکن وہ پیار بھری باتوں اور میٹھی ڈانٹ کو ترستی رہی۔

بہو روز آتی صبح و شام۔ دُودھ دھوتی۔ لیکن نہ گائے کو وہ پیار دے سکی جسکی وہ عادی تھی۔ اور نہ گائے اتنا دُودھ دے سکی جسکی یہ عادی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں گائے نے دُودھ بہت کم کر دیا۔ اور بہو چمکارنے دُلارنے کے بجائے چھڑی اُٹھا کر مارنے لگتی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جونہی بہو دُودھ دھونے کیلئے گائے کے پاس جاتی۔ گائے دولتی مارتی اور کتنی بار اُس نے بہو کو زخمی بھی کیا۔ اور آج گائے نے حد ہی کر دی۔ دولتی مار کر بہو کو زمین پر چت گرا دیا۔ اور دُودھ کا برتن چھوٹ کر دور جا کر ٹوٹ گیا۔ اور گائے نے اگلی ٹانگ اُٹھا کر بہو کے سینے پر اسطرح رکھدی۔

گویا تنبیہ کر رہی ہو کہ اگر اپنا سارا بوجھ ڈالدوں تو تجھ جیسی بُری عورت کا بھرکس نکل جائیگا۔

بہو کی درّدناک چیخ نکل گئی۔ انور دوڑتا ہوا گاؤخانے میں گیا۔ بیوی کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ گائے نے خطرے کی بو سونگ لی۔ اُس نے ایکدم بہو کے جسم پر سے ٹانگ اُٹھائی۔ اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے دونوں کو دیکھتی رہی۔ بہو اُٹھ کھڑی ہوگئی۔ اور چھڑی اُٹھا کر آؤ دیکھا نہ تاؤ گائے کو مارنے لگی۔ انور اُسے روکتا رہا۔ کہ گائے کو بچہ ہونے والا ہے کچھ ہو جائیگا۔ لیکن وہ ماننے والی کہاں تھی۔ جب گائے کو خوب مارا تب اُسکا غصّہ کسی حد تک کم ہوگیا۔ اُس نے قسم کھائی کہ اس گھر میں گائے رہے گی یا وہ۔ جب تک نہ اسکو بیچ ڈالوں مجھ پر اس گھر کا دانہ پانی حرام وہ جو کچھ منہ میں آیا بکتی رہی۔ ''میری ساس گھر سے کیا گئی۔ اپنی جگہ اس گائے کو بٹھا گئی۔''

بیوی کی ضد کے آگے انور مجبور ہوگیا۔ اور اُس نے اُسی روز گائے کو دوسرے گاؤں کے ایک آدمی کے ہاتھوں فروخت کیا۔ گائے آنسو بہاتی ہوئی بڑی مشکل سے رخصت ہوئی۔

تین دن گزر گئے۔ گائے خریدنے والا گائے سمیت واپس آگیا۔ اور انور سے بڑی نرمی اور سنجیدگی سے بولا۔

''انور بھائی مہربانی کر کے اپنی گائے واپس لے لو۔''

''کیوں؟ سودا کر کے پھر جانا بے ایمانی ہے۔''

وہ اس لئے کہ جب سے گائے اس گھر سے گئی ہے۔ اُس نے چارے کا ایک تنکا تک مُنہ میں نہیں ڈالا۔ نہ اس نے ہمارے گھر کا بھوسہ کھایا۔ نہ پانی پیا۔ بلکہ مُسلسل آنسو بہائے جارہی ہے۔ مجھ سے اس بے زبان جانور کی یہ بے بسی نہیں دیکھی گئی۔ اس لئے اسکو واپس لایا ہُوں۔ انور کے جواب دینے سے پہلے اُسکی بیوی بول پڑی۔ سودا تو ہو چکا ہے۔ ہم گائے کو واپس نہیں لینگے۔ یہ تو خریدار کی قسمت ہے کہ گائے مرے یا جیئے۔

خریدار کو غصہ آیا۔ اور اُس نے کہا کہ میں گاؤں کی پنچایت سے درخواست کروں گا دیکھوں گا کہ آپ کیسے گائے کو واپس نہیں لیتے۔

تھوڑی دیر کے بعد پنچایت بیٹھ گئی۔ دونوں طرف کی باتیں سُنی گئی۔ بحث وتکرار ہوتی رہی۔ اتنے میں نورہ چاچی بھی پنچایت میں آ گئی۔ اور پنچوں سے کہنے لگی۔ آپ سب عزت دار اور معتبر لوگ ہیں۔ میں ایک گزارش کرنا چاہتی ہوں۔''

سرپنچ بولا۔ ''کہیے کیا کہنا چاہتی ہیں آپ۔''

''انور سے کہیے کہ وہ خریدار کو پیسے واپس کرے اور گائے مجھے دے دے۔ کیونکہ گھر سے نکلتے وقت میں نے انور سے کچھ مانگا ہے اور نہ گھر سے کچھ لیا

ہے۔"

گائے نے نورہ چاچی کی آواز سُنی ۔ وہ ایکدم نورہ چاچی کے پاس آگئی اور اپنے سینگوں سے چاچی کو چھیڑنے لگی۔ چاچی کی آنکھوں میں آنسو آگئے ۔ وہ گائے پر اپنا ہاتھ پھیرنے لگی۔ گائے آنسو بہارہی تھی۔ اور چاچی ہاتھ پھیر کر جیسے اُسکے زخموں کو مرہم لگارہی تھی ۔ چاچی لپک کر گئی اور گھاس لاکر گائے کے سامنے رکھ دیا اور بولی" لے کھا۔ بھوکی رہنے سے خود ہی مرجاؤ گی۔ دوسروں پر اسکا کوئی اثر نہیں ہوگا۔"

گائے نے پھنکار کر گھاس کو مُنہ لگایا اور کھانے لگی ۔ چاچی ہاتھ پھیرتی رہی اور کہتی جارہی تھی" جو میری کوکھ سے جنم لے کر میرے نہ ہوسکے۔ وہ تیرا دُودھ پی کر تیرے کیا بن سکیں گے ۔ کھا گھاس کھا۔ ابھی میں زندہ ہوں تم کہیں نہیں جاؤ گی۔"

پنچایت کے ممبر یہ نظارہ دیکھ کر حیراں رہ گئے ۔ اور سارا ماجرہ معلوم کرنے لگے ۔ اکرم نے نورہ چاچی پر بیتی ساری کہانی سُنادی ۔ پنچایت نے انور اور اسکی بیوی کو آڑے ہاتھوں لیا اُنہوں نے کہا کہ بیٹا ہو کر تمہارا اپنی ماں کیساتھ یہ سلوک ہے۔ تو کیسا آدمی ہے۔ تم سے تو یہ گائے اچھی ہے۔ جو تمہاری ماں کا پیار اُسکی خدمت نہیں بھولی ۔ اور واپس آگئی ۔ ایک تم ہو انسان ہو کر تمہارے دل میں ماں

کیلئے کوئی عزت نہیں۔ پنچایت کے سامنے انور اور اُسکی بیوی کی بہت بڑی گت بنی ۔پنچایت والوں نے دونوں میاں بیوی کو سمجھایا کہ نورہ چاچی ہی گھر کی اصل مالکن ہے۔ کیونکہ یہ گھر اُسکے مرحوم شوہر کا ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم میاں بیوی کو گھر سے بے دخل کر سکتی ہے۔ اور ساری جائیداد سے محروم کر سکتی ہے۔

بات انور اور اسکی بیوی کی سمجھ میں آ گئی ۔ اُن دونوں نے پنچایت کے سامنے نورہ چاچی سے معافی مانگ لی۔ اور اُسے منا کر گھر لے آئے ۔ اسکے بعد وہ ہمیشہ ہنسی۔ خوشی اور پیار و محبت سے اپنے گھر میں رہنے لگے۔

☆☆

احسان کا بدلہ

بچو یہ ایک سچی کہانی ہے۔ آنکھوں دیکھی اور کانوں سُنی ۔ بچّو اگر آپ کسی سے پیار کرینگے۔ کسی کی مُصیبت میں اُسکے کام آینگے۔ کسی کی جان بچائینگے ۔ تو وہ ضرور آپکے اس کام کی قدر کرے گا۔ اور آپکا احسان مان کر آپ سے پیار کرنے لگے گا۔ اور آپکے احسان کے بدلے آپ کیساتھ احسان ضرور کریگا۔

ہاں تو کہانی یوں ہے۔ کہ ایک مینا کا جوڑا ایک بار ایک گھر کے آنگن میں لگے ایک خوبانی کے پیڑ پر گھونسلہ بنانے لگا۔ گھر والوں نے دیکھا۔ تو وہ بہت خوش ہوئے اور بہت ہی غور اور انہماک سے مینا کو گھونسلہ بناتے ہوئے دیکھتے رہے۔ مینا نے چھوٹی چھوٹی تیلیاں لاکر اور اُن میں تنکے لاکر ایک ٹوکری نما گھونسلہ بنایا۔ گھونسلہ اندر سے بڑا نرم اور مُلایم تھا۔ مینا نے اسمیں انڈے دئے اور اُنہیں سینے لگی ۔ بیچاری مادہ مینا تھوڑی دیر کیلئے گھونسلے سے باہر آتی ۔ دانے چگتی اور زیادہ دیر انڈوں پر ہی بیٹھی رہتی۔ جتنی دیر مادہ مینا دانہ چگنے جاتی نر مینا تب تک انڈوں پر بیٹھ کر انکی حفاظت کرتا رہتا۔

کچھ دنوں کے بعد انڈوں سے بچّے نکل آئے ۔ گوشت کے لوتھڑے ۔ نہ

بال نہ پر۔ نہ آنکھیں کُھلی۔ صرف ایک چونچ تھی۔ جو ہر آہٹ پر کُھلتی تھی۔ بچّوں کے ماں باپ دن میں سو پھیرے لگاتے۔ کیڑے۔ مکوڑے دانے وغیرہ چُن چُن کر لاتے۔ اور بچّوں کو کھلاتے رہتے۔ دھیرے دھیرے بچّوں کی پرورش ہونے لگی۔ اُنکی آنکھیں کُھل گئیں۔ بال و پر نکل آئے۔ اب وہ گھونسلے میں چرپ چرپ کی آواز کر کے بہت شور اُٹھاتے رہتے تھے۔

ایک شام کی بات ہے کہ مینا اپنے گھونسلے میں اپنے بچوں کو پروں میں چھپائے رات بتانے کی تیاری میں تھی۔ اور نر مینا گھونسلے کے پاس ہی درخت کی ٹہنی پر تھا۔ اچانک ایک الّو کہیں سے آ گیا۔ وہ مادہ مینا کو گھونسلے سے اُٹھا کر پنجوں میں بھر لینا چاہتا تھا۔

جانتے ہو بچّو! الّو چھوٹے چھوٹے پرندوں کا جانی دُشمن ہے۔ رات کو جھپٹا مار کر اُنہیں اُٹھا کر کھا جاتا ہے۔ بیچارے پرندے اس آفت کو دیکھ کر شور مچانے لگتے ہیں۔ اور اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ جونہی الّو نے مینا کو اُٹھانا چاہا۔ مینا کی خوف کے ماری چیخ نکل گئی۔ نر مینا نے شور اُٹھایا۔ آس پاس کے پرندے گھونسلوں سے نکل آئے اور شور کرنے لگے تو گویا یہ پرندوں کیلئے قیامت کا سماں تھا۔

اتفاقاً گھر کی مالکن باہر آنگن میں اِسی پیڑ کے پاس کھڑی تھی۔ اُس نے

پرندوں کا شور سُنا۔ غور سے دیکھا تو الّو مینا کو اُٹھا کر لیجانے کی کوشش کرتے دیکھا۔ تو اُس سے رہا نہ گیا۔ اُس نے پیڑ کے قریب پڑی ہوئی ایک لمبی لاٹھی کو اُٹھایا۔ اور الّو کو مارنے لگی۔ الّو گھبرا گیا۔ کیونکہ وہ اس اچانک حملے کیلئے تیار نہ تھا۔ اُس نے ایکدم مینا کو چھوڑ دیا۔ اور بھاگ کھڑا ہوا۔ مینا زمین پر گری۔ الّو نے اُسے زخمی کیا تھا۔ وہ اُڑنے کے قابل نہیں تھی۔

مالکن مینا کو اُٹھا کر اندر لے گئی۔ زخموں کی مرہم پٹی کی اور واپس لا کر گھونسلے میں رکھ دیا۔ دوسرے دن اکیلا نر مینا بچوں کو کھلانے لگا۔ لیکن اُس کیلئے بڑی مشکل ہو رہی تھی۔ مادہ مینا اُڑنے کے قابل نہیں تھی۔ مالکن نے یہ سوچ کر کہ مادہ مینا کی مشکل آسان ہو جائے۔ اُس نے برتن میں چاول بھر کر لائے اور درخت کے پاس آنگن کی دیوار پر رکھ دیا۔ نر کیلئے آسان ہو گیا وہ جلدی جلدی بچوں کا پیٹ بھرتا رہا۔ اور مادہ مینا نے بھی کچھ دانے کھا لئے۔ اب مالکن روز برتن میں چاول ڈال کر دیوار پر رکھ دیتی۔ بچے پیٹ بھر کر کھاتے اور مادہ مینا بھی کھاتی رہتی۔ اور ٹھیک ہوتی رہی۔ اسکے بدن میں طاقت آ گئی۔ اور وہ اُڑنے کے قابل ہو گئی۔ اور بچے بھی پروں والے ہو گئے۔ اور دھیرے دھیرے اُڑنے کے قابل ہو گئے۔ اور ایکدم اُڑ گئے۔ اور اپنا الگ گھونسلہ بنا لیا۔

بچّو مالکن کی اس مہربانی نے نہ صرف مینا کے جوڑے۔ بلکہ اس درخت پر

رہنے والے دوسرے پرندوں کو بھی مالکن کا احسان مند بنایا۔ کیونکہ مار کھانے کے بعد اُلو کبھی بھی اُس درخت کے پرندوں کو ستانے کیلئے نہیں آیا۔ اور پرندے مالکن سے بہت ہل مل گئے تھے۔ مالکن صبح اُٹھتی۔ گھر کا دروازہ کھولتی تو سب پرندے اُسکے سر پر منڈلانے لگتے۔ اور سردی ہو گرمی مالکن ہر روز پرندوں کیلئے دانے بکھیرتی اور وہ آرام سے چُگ لیتے۔ اور جب کبھی مالکن اپنے بچے کا پالنا برآمدے میں رکھتی تو مینا کا جوڑا پالنے کے کنارے بیٹھ کر اپنی بولی بولتے اور سر ہلا کر جیسے بچّے کو ہنسانے کی کوشش کرتے اور بچہّ تو اتنا مانوس ہو گیا تھا کہ وہ اگر روتا ہوتا تو مینا کو دیکھ کر ایکدم چُپ ہو جاتا۔ اور مینا کے بولنے اور سر ہلانے پر مُسکرا دیتا۔

ایک دن کی بات ہے۔ بہار کا موسم تھا۔ سماں بڑا سُہانا تھا۔ گھر کے سب لوگ کہیں گھومنے گئے تھے۔ گھر میں صرف مالکن اور اُسکا دودھ پیتا بچہ تھا۔ مالکن نے بچے کا پالنا باہر برآمدے میں رکھدیا۔ اور خود گھر کا کام کاج کرنے میں مصروف ہوگئی۔

اچانک ایک موٹا۔ لمبا سا کالا سانپ کہیں سے آنکلا اور برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا درخت پر بیٹھی مینا کی نظر اُس پر پڑی۔ اُس نے شور مچایا۔ اور سانپ کے اوپر منڈلانے لگی۔ لیکن جوں جوں سانپ اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا۔ مینا اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر چلاتی۔ پھڑ پھڑاتی اور سانپ کو چونچ مارتی جاتی۔

دوسرے پرندوں نے مینا کی درّد بھری آواز پہچان لی ۔اور دیکھتے ہی دیکھتے دوسرے پرندے جن میں ۔کوے۔بُلبُل ۔ چڑیا۔ اور باقی مینا ئیں شامل تھیں سانپ کے اوپر منڈلانے لگے ۔شور اُٹھایا۔کوئی کوئی تو سانپ کو چونچ مارنے بھی آجاتا۔

پرندوں کا شور سُن کر مالکن سمجھ گئی کہ باہر کوئی آفت آگئی ہے۔وہ ایکدم باہر نکل آئی۔ جونہی اُس نے برآمدے میں قدم رکھا۔اُسکی نظر موذی سانپ پر پڑی۔سانپ آدمی کو دیکھ کر خوفزدہ ضرور ہوجاتا ہے۔ وہ سیڑھیوں سے واپس اُترنے لگا اور آنگن میں جدھر سے آیا تھا۔اُدھر ہی چلا گیا۔اسطرح مینا جیسی ایک ننھی سی جان نے مالکن کے معصوم بچے کی جان بچائی اوراحسان کا بدلہ احسان سے دیا۔

اور بستی بس گئی

پوری تحصیل ایک پہاڑی علاقہ تھا۔ پہاڑیوں پر دُور دُور بستیاں بسی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ اوران پہاڑیوں کے درمیان ایک چھوٹی سی وادی تھی۔ اس وادی میں تحصیل کا صدر مقام تھا۔ جوایک بڑا ہی خوبصورت قصبہ تھا۔ اس قصبے میں تحصیل کے صدر دفاتر تھے۔ ایک تحصیلدار کا دفتر تھا۔ پولیس سٹیشن تھا۔ ایک منصف کی عدالت تھی۔ ایک ہیلتھ سینٹر تھا ایک انمل ہسبنڈری کا یونٹ تھا۔ دو ہائر سکینڈری سکول تھے۔ ایک لڑکوں کیلئے دوسرا لڑکیوں کیلئے۔ بنک کی شاخ تھی۔ سوشل ویلفیر آفس۔ اور ایک ویلفیر سنٹر تھا۔ غرض چھوٹے پیمانے پر مکمل حکومتی انتظام تھا۔ لیکن اس سب کے باوجود علاقہ پہاڑی ہونے کیوجہ سے لوگ گونا گوں مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کررہے تھے۔ زیادہ تر لوگ ان پڑھ تھے حالانکہ حکومت نے ہر بڑے گاؤں میں سکول کھول رکھے تھے۔ مگر یا تو وہاں اُستاد جاتے نہیں تھے۔ اگر اُستاد ہوتے بھی تو گاؤں کے لوگ زمینداری۔ مال مویشی پالنے۔ جنگل سے لکڑیاں لانے۔ اور مزدوری کیلئے شہری علاقوں کا رُخ کرتے تھے اسطرح زیادہ آبادی ان پڑھ ہی رہتی تھی۔ اور ان پڑھ ہونیکے وجہ سے بستی طرح

طرح کی اخلاقی اور سماجی بُرائیوں میں مُبتلا ہو گئی تھی۔ دین وایمان حتیٰ کہ عزت و آبرو بھی بھُلا چکے تھے۔

انہی پہاڑیوں میں ایک گاؤں ملنگ کوٹ بھی تھا۔ جہاں اسلم خان نامی ایک شخص اپنے خاندان کے ساتھ رہتا تھا۔ اسلم خان کیساتھ اُسکے بوڑھے ماں باپ۔ اسکی بیوی اور دو بچے تھے۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ خوش نہیں تھا۔ اُسکا دل اپنے گاؤں کے لوگوں کے کرتوت دیکھ کر کڑھتا تھا۔ اور وہ اندر ہی اندر خون کے آنسو بہاتا تھا۔ وہ گاؤں والوں سے الگ مزاج ۔ الگ عادات اور اطوار کا مالک تھا۔

اسلم خان بچپن میں ہی اپنے چاچا کیساتھ شہر گیا تھا۔ وہاں اُسکا چاچا کسی بڑے آدمی کے گھر میں نوکر تھا۔ اُس نے اسلم کو بھی ایک ڈاکٹر کے ہاں بچہ پالنے کیلئے نوکر رکھ دیا۔ اسلم دن بھر ڈاکٹر کے بچوں کیساتھ رہتا۔ اچھا کھاتا۔ اچھا پہنتا۔ صاف ستھرا رہتا۔ اور ڈاکٹر کی بیوی اُسے اپنے بچوں کیساتھ پڑھاتی ۔ اور اسطرح اُس نے بھی وہ سب کچھ پڑھا جو ڈاکٹر کا بیٹا پڑھتا تھا۔ یہ بات الگ ہے کہ وہ کوئی امتحان پاس نہیں کر سکا۔ لیکن اُسکے پاس علم تھا۔ وہ اچھے بُرے کی پہچان رکھتا تھا۔

بچپن سے لیکر جوانی تک اسلم خان اپنے گاؤں کچھ دنوں کیلئے آتا۔ اور مہمان کی طرح کچھ دن رہ کر چلا جاتا۔ اور جتنے دن گاؤں میں رہتا۔ اپنے گھر

والوں کو اپنے ہمسایوں کو۔ اپنے ساتھیوں کو اچھی باتوں کی تلقین کرتا رہتا۔ صحت وصفائی کی باتیں بتاتا۔ اچھی عادتیں سکھاتا۔ مگر جب وہ واپس چلا جاتا۔ سب کچھ ویسے کا ویسا رہتا۔ گاؤں والوں نے اُسکو طنزاً ''بابو صاحب'' نام رکھ دیا تھا۔ شادی کے بعد اسلم خان مُستقل طور پر گاؤں میں ہی رہنے لگا۔ وہ گاؤں والوں کو سمجھانے کے کئی جتن کرتا رہا لیکن گاؤں والے اُسکی نصیحتوں سے چڑتے تھے۔ اُسے بُرا بھلا کہتے۔ کبھی کبھی جھگڑا بھی کرتے۔ لوگ اسلم کو طعنہ مارتے کہ صاحب لوگوں کی غلامی کرتے کرتے اپنے آپ کو صاحب سمجھ بیٹھا ہے۔ اس گاؤں میں رہنا ہے تو اپنی اوقات میں رہ۔ جیسا سب کرتے ہیں۔ ویسا کر۔ لیکن لوگوں کو کون سمجھائے کہ یہ صاحب لوگوں کی غلامی نہیں سکھاتا۔ بلکہ علم بولتا ہے۔ وہ علم جو اسلم نے پڑھا تھا۔

اسلم خان جب سبز اور نوجوان جنگلی درختوں کو کٹتے دیکھتا۔ تو اسکا دل دُکھی ہوتا۔ وہ لوگوں کو ایسا کرنے سے منع کرتا۔ اور اُنہیں ان خطرات سے آگاہ کرتا۔ جو جنگل کٹنے سے درپیش آتے ہیں۔ وہ بتاتا رہتا۔ جنگل کائینات کے توازن کیلئے پھیپھڑوں کا کام کرتے ہیں۔ اور انسانی زندگی کیلئے کس قدر اہم ہیں۔ اگر جنگل نہ رہے۔ تو پانی کی کمی ہو جائیگی۔ ساری باولیاں اور چشمے سوکھ جائینگے۔ بارش نہیں برسے گی۔ زمین بنجر ہو جائیگی۔ اور گرمی ناقابل برداشت ہو جائے گی۔

وہ لوگوں کو بتاتا رہتا۔ ''پانی میں گندگی مت ڈالو۔ پانی آلودہ ہو جاتا

ہے۔ بیت الخلاء پانی کی طرف مت بہاو۔ طرح طرح کی بیماریاں۔ جیسے یرقان۔ ٹائیفائیڈ۔ اُلٹیاں اور دست لگ جاتے ہیں۔ گھر کا کوڑا کرکٹ۔ جمع کر کے جلایا کرو۔ تاکہ گندگی نہ پھیلے۔"

وہ لوگوں کو تاکید کرتا رہتا۔ "کم مت تولو۔ کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ مت کرو۔ ناجائز منافع خوری مت کرو۔ ذخیرہ اندوزی کر کے چیزوں کی قلت پیدا مت کرو۔ مقررہ قیمت سے زیادہ وصول مت کرو۔ یہ گناہِ عظیم ہے۔"

وہ لوگوں کو تاکید کرتا پھرتا۔ کہ بچوں کو سکول بھیجو۔ پڑھ لکھ کر اچھی ذہنیت کے مالک ہو جائینگے۔ اور اچھے انسان بنیں گے۔ وہ مسجد کے امام صاحب سے بھی کہہ دیتا کہ خالی خولی جنت و جہنم کی باتیں کرنے کے بجائے لوگوں کے اخلاق سدھارنے کی طرف توجہ دیجئے لوگ سدھر جائینگے تو اچھے بھلے کی تمیز کر سکیں گے اور خود جہنم کا راستہ چھوڑ کر جنت کی طرف مائل ہو جائینگے۔

وہ عورتوں کے پاس جا کر کہہ دیتا کہ اپنا خالی وقت اڑوس پڑوس کی عورتوں کیساتھ گپ شپ اور غیبت کرنے۔ چغل خوری اور ساس بہو کے جھگڑے کو ہوا دینے میں مت گزارو۔ بلکہ گھریلو دستکاریوں کی طرف توجہ دیکر اپنا وقت بہترین طریقے سے گزارو۔ اور اپنی آمدنی میں اضافہ کرو۔

لیکن اُسکی یہ باتیں سب کو جیسے زہر لگتی تھیں۔ اندر اندر سے سب لوگ

اسکے خلاف تھے۔ سب نے مل کر اسلم خان کیساتھ قطع تعلق کرلیا۔ پورا گاؤں ایک طرف اور اکیلا اسلم خان ایک طرف۔ وہ گاؤں والوں کے برتاو سے تنگ آ گیا۔ اُس نے سوچا کہ وہ گاؤں چھوڑ کر چلا جائیگا۔ لیکن پھر خیال آیا یہ بزدلی ہوگی۔ اور لوگوں کو اچھی باتیں نہ بتانا بھی بزدلی ہے۔ اُس نے من میں ٹھان لی کچھ بھی ہو وہ مقابلہ ضرور کرے گا۔ گاؤں والے بھی روز روز کی تکرار سے تنگ آ گئے۔ اُنہوں نے مشورہ کیا کہ کیوں نہ اسلم خان کو ہی گاؤں بدر کردیں۔ اور ہوا ایسا ہی۔ ایک دن سب گاؤں والوں نے اسلم خان کی جم کر پٹائی کی۔ اُسکا چھوٹا سا مکان تباہ کردیا۔ اُسکے کھیت میں کھڑی فصل کو بھی تباہ کرڈالا۔ اور اُسے مجبور کیا کہ وہ گاؤں چھوڑ کر چلا جائے۔ اسلم خان اپنے اور اپنے کنبے کے تحفظ کی خاطر گاؤں چھوڑ کر چلا گیا۔ اور اپنے دُور والے کھیت میں اپنے لئے ایک جھونپڑی بنالی۔ دوسری جھونپڑی اپنے مویشیوں کیلیئے خود ہی تیار کی۔

گرمیوں کے دن بیت گئے۔ اکتوبر کا مہینہ آیا۔ اسلم خان کو پریشانی لاحق ہوگئی۔ کہ آنے والی سردیوں میں وہ کیا کرے گا۔ کیونکہ اُسکے پاس محفوظ اور مضبوط مکان نہیں تھا۔ ابھی اکتوبر مہینے کے سات دن گزرے تھے اور یہ آٹھ اکتوبر 2005ء کی بات ہے کہ صبح ساڑھے نو بجے شدید زلزلہ آیا۔ اس پہاڑی تحصیل کے تقریباً نوے فیصدی گاؤں تباہ و برباد ہوگئے۔ مکان چونکہ پتھروں سے بنے

تھے۔ایک ہی جھٹکے میں ملبے کے ڈھیر بن گئے۔اسلم خان کا پورا گاؤں تباہ ہوگیا۔ لوگ جتنے گھروں کے اندر تھے۔ وہ اندر ہی دب گئے۔اور جو باہر تھے وہ درختوں کے گرنے سے۔ دیواروں کے گرنے سے ملبے کے نیچے دب گئے۔گھروں سے باہر گئے لوگوں میں سے اکا دُکا کوئی سلامت رہا۔دبے ہوئے لوگوں میں سے کچھ ہی لوگ خوش قسمت ثابت ہوئے۔ جو امدادی اداروں نے ملبے کے نیچے سے زندہ نکالے۔کچھ زندہ لوگ اتنے زخمی تھے کہ باہر نکل کر زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسے۔ بالکل جیسے قیامت کا سماں تھا۔کسی گھر کی ساٹھ سالہ دادی زندہ بچ گئی۔تو کسی گھر کی ایک سال کی پوتی بچ گئی۔کسی گھر کا دس سال کا لڑکا بچا۔تو کسی گھر کا جوان لڑکا۔ کوئی ہی خوش قسمت گھر تھا۔جسمیں ایک ہی گھر کے دو فرد زندہ بچ گئے ہوں۔ایک ہی خاندان کے الگ الگ رہنے والے کنبوں میں دو یا چار لوگ زندہ بچے گئے تھے

اس پر آشوب وقت میں صرف اسلم خان ایسا خوش قسمت شخص تھا۔جسکا پورا خاندان زندہ اور سلامت تھا۔کسی کو خراش تک نہ لگی تھی۔نہ ہی اُنکا جھونپڑا دبا تھا۔اسلم خان امدادی کارکنوں کے ساتھ شامل ہوگیا۔اپنے گاؤں کے لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکلواتا۔اور امدادی کارکنوں کو گھر والوں کی تفصیل بتاتا۔اور اسطرح کتنے ہی لوگ زخمی حالت میں بھی بچائے گئے۔

جب تک سرکاری مشینری خوراک کا انتظام کرتی ، دوادارو کا انتظام کرتی۔

تب تک اسلم خان اور اسکے گھر والوں نے اپنے گھر سے راشن لالا کر بے آسرا لوگوں کو کھلایا۔ انکے زخموں کو صاف کیا۔ پٹی باندھی۔ غرض ہر طرح سے آرام و آسایش پہنچانے کی کوشش کی۔ لوگ تشکر اور احسان بھری نظروں سے اُسے تکتے جاتے تھے اور آہ بھر کر رہ جاتے تھے۔

طوفان تھم چُکا تھا۔ رفتہ رفتہ زندگی معمول پر آرہی تھی۔ زندہ بچے لوگ اپنے عزیز و اقارب کیلئے آنسو بہاتے اور اپنے زندہ رہنے کیلئے سامان پیدا کرنے لگے۔

زندگی پھر سے رواں دواں ہونے لگی۔ سرکار نے عارضی طور ٹین کے شیڈ بنا کر دئے۔ راشن مہیا کیا۔ کپڑے لتے کا انتظام ہوگیا۔ دو ہزار نفوس کے گاؤں میں صرف ڈیڑھ سو لوگ بچے تھے۔ ان میں ستر کے قریب زخمی تھے۔ تیس لوگ ایسے تھے جو جسمانی طور ناکارہ ہوگئے تھے۔ زندگی اُنکے لئے بوجھ تھی اور وہ دوسروں کیلئے بوجھ تھے۔ ایسی حالت میں زندہ بچنے والا ہر فرد اپنا محاسبہ کر رہا تھا۔ اور اُن کو یہ آئی آفت اپنے گناہوں کا پھل لگ رہی تھی۔ اور ایسی حالت میں اسلم خان ایسا شخص تھا۔ جو انکی خدمت کے ساتھ ساتھ اُنکی بڑی دلجوئی کر رہا تھا۔ لوگ اُسکا سامنا کرنے سے گھبرا رہے تھے۔ اور شرمندہ ہو رہے تھے۔

اسلم خان نے اُنکی اس ذہنی و قلبی حالت کا جائزہ لیکر اُنہیں ایک بار پھر

پچھلی تمام بُرائیوں سے توبہ کرنے کیلئے کہا۔اور سمجھایا کہ بُرے کام کا انجام ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔لہذا آیندہ کیلئے سدھر جاو اور اپنی زندگی کو اللہ اور رسولؐ کے بتائے ہوئے راستے پر لگادو۔اور انسانیت کی بقا کیلئے تمام بُرے کام چھوڑ کر سکون واطمینان کی زندگی بسر کرو۔

اور یوں نئے سرے سے اس گاؤں کی بستی بسنی شروع ہوگئی۔

لالی

جانوروں کی دُنیا الگ اور عجیب ہوتی ہے۔لیکن کچھ پالتو جانور اگر پیار اور محبت سے پالے جائیں۔تو وہ انسان سے اتنے مانوس ہوجاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ انسان کی اتنی خدمت اور وفاداری کرتے ہیں کہ اپنے سگے رشتے داروں سے بھی ممکن نہیں۔ یہ جانور اپنی وفاداری کا ثبوت اپنے آپ کو اپنے مالک کیلئے خطرے میں ڈال کر بھی دیتے ہیں۔ پھر چاہے اُنکی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ پرواہ نہیں کرتے ہیں۔ایسی ہی ایک کہانی ہے ایک معصوم سے لڑکے اور اُسکی گھوڑی کی۔

ایک پہاڑی گاؤں میں ایک آدمی رہتا تھا۔ جسکا نام حسن تھا۔حسن محنت مزدوری کر کے اپنے بال بچوں کو پالتا تھا۔حسن کی زمین زیادہ نہ تھی بس دو کنال تھی۔ جو پہاڑی کے دامن میں تھی۔اس زمین میں بادام کے کچھ درخت تھے۔اور ان درختوں کے بیچوں بیچ کبھی فصل کے نام پر مونگ۔کبھی مکئی کی کھیتی بھی کرتا تھا۔ لیکن فصل ناکافی تھی۔البتہ جانوروں کیلئے کسی حد تک چارہ بنتا تھا۔حسن کے گھر میں ایک گھوڑی اور ایک گائے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔گھوڑی بوجھ ڈھونے کے کام

بھی آتی تھی۔ اور سال ڈیڑھ سال کے بعد بچہ بھی دیتی تھی جسکو حسن سال۔ دو سال پالتا۔ پھر اچھے داموں میں بیچتا تھا۔

حسن کے تین بچے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ ایک بیٹا جو سب سے بڑا تھا۔ اُسکی عمر دس سال کی تھی۔ اُسکا نام رشید تھا۔ لیکن پیار سے اُسے راجا کہتے تھے۔ راجا اور گھوڑی بہت ہی ہل مل گئے تھے۔ راجا نے گھوڑی کا نام لالی رکھا تھا۔ وہ لالی کو پہاڑی پر چرانے لے جاتا۔ اُسکی ننگی پیٹھ پر سواری کرتا اور گھوڑی اُسے بالکل اپنے بچے کی طرح پیار کرتی۔ اُس نے کبھی بھی راجا کو اپنی پیٹھ سے نہ گرایا تھا۔ راجا لالی بلاتا۔ وہ دوڑتی ہوئی آتی۔ اور اپنا مُنہ راجا کے ساتھ رگڑتی۔ اور اپنا سُم اوپر اُٹھا کر زمین پر مارتی۔ اسطرح اپنے پیار کا اظہار کرتی۔ راجا اگر اُسے واپس جانے کو کہتا تو لالی واپس چلی جاتی۔ گویا وہ راجا کا حکم مانتی تھی۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا۔ حسن اپنے کھیت میں کام کر رہا تھا کہ زوروں کی بارش شروع ہوئی قبل اسکے حسن گھر کی طرف نکلتا زور کی گرج کے ساتھ بجلی کڑکی اور بادل پھٹ گیا۔ حسن اپنی زمین پر جس درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ وہیں بجلی گرنے سے جھلس گیا۔ اور مر گیا۔ گھر میں کہرام مچا۔ غریب گھرانے میں کوئی کمانے والا نہ تھا۔ اور ساری کی ساری ذمے داری راجا کے سر پر آپڑی۔

اب راجا بڑی مُشکل میں پھنس گیا تھا۔ عمر چھوٹی تھی۔ جسم کمزور تھا۔ کام کا

تجربہ نہ تھا۔ اُسکی ماں راجا کو لیکر کھیت پر جاتی۔ تھوڑا سا کام بھی کرتی اور گائے کیلئے گھاس لے آتی۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی۔ دو وقت کی روٹی کے بجائے ایک وقت ملنے لگی۔ پھر وہ بھی ختم۔ اور گھر میں بالکل فاقہ ہو گیا۔ راجا بھو کے پیٹ لالی کو لیکر جنگل کی طرف نکلا۔ راستے بھر سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے کہ گھر میں روٹی کا انتظام بھی ہو۔ اور کرنے کیلئے کچھ کام بھی مل جائے۔ لالی گھاس چرتی رہی۔ راجا سوچتا رہا۔ بھوک سے اُسکا بُرا حال تھا۔ شام ہو گئی لیکن وہ گھر نہیں گیا۔ سوچتا رہا کہ وہاں سب لوگ بھوک سے بلک رہے ہونگے۔ اتنے میں جنگل کی طرف سے گھوڑوں کی ٹاپ سُنائی دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پندرہ بیس گھوڑ سوار بندوقوں سے لیس۔ راجا کے ارد گرد تھے۔ راجا سمجھ گیا کہ ڈاکو ہیں۔ سرکاری سپاہی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہ وردی میں ملبوس ہوتے ہیں۔ سردار نے راجا کو دیکھا۔ حکم دیا۔ لڑکے کو اُٹھایا جائے۔ ایک سوار آگے بڑھا۔ راجا کو اُٹھا کر سردار کے سامنے لایا۔ اور بولا۔

''سردار اس لڑکے کا کیا کرینگے''۔

سردار بولا۔ ''ہمارے چھوٹے موٹے کام کیا کرے گا''۔

اور ڈاکو نے راجا کو اُٹھا کر اپنے گھوڑے پر بیٹھا لیا۔ اُسکی زبان سے لالی کا نام نکل گیا۔ اور لالی دوڑتی ہوئی آئی۔ سردار نے گھوڑی کو دیکھ کر کہا بہت خوب۔ اسکو بھی لے چلو کام آئے گی۔ دوسرے ڈاکو نے لالی کی رسی پکڑ لی اور دوڑ پڑے۔

ڈاکو پاس کے ایک گاؤں میں ڈاکہ ڈالنے گئے۔ ڈاکوؤں نے گولیاں چلائی۔ لوگ خوفزدہ ہو گئے۔ لوگ دبکے پڑے رہے۔ ڈاکو۔ مکانوں دکانوں سے سامان لوٹتے رہے اور گھوڑوں پر لادتے رہے۔ ڈاکو زیادہ تر راشن کا سامان اور نقدی۔ زیور لوٹتے رہے۔ ڈاکوؤں نے لالی کی پیٹھ پر سب سے پہلے۔ راشن کا سامان۔ دو بوری چاول۔ چائے۔ چینی اور ایک پیپہ کھانے کے تیل کا رکھ دیا۔ اب وہ پکڑے گئے گھوڑوں اور اپنے ساتھ لائے گھوڑوں پر سامان لادنے لگے۔ اس افراتفری کے درمیان گھوڑی راجا کے قریب آئی۔ راجا دھیرے دھیرے بولا۔ لالی چپکے سے جا اور یہ سارا سامان گھر میں چھوڑ آ۔ اور واپس دوڑ کے آنا۔ یہ سننا تھا کہ لالی گھوڑوں کے درمیان سے پیچھے ہٹتی گئی۔ کسی کو پتہ نہیں چلا۔ تھوڑی دُور جا کر سرپٹ دوڑ کر ایک کلومیٹر کے فاصلے پر اپنے گھر کے آنگن میں ہنہنائی۔ راجا کی ماں سمجھ گئی کہ شاید راجا آیا ہے۔ وہ ایکدم دروازہ کھولنے گئی۔ باہر نکل کر دیکھتی ہے کہ صرف گھوڑی ہے۔ گھوڑی نے نیچے بیٹھ کر اس طرح سے اپنا بوجھ اتار دیا۔ کہ کسی چیز میں خلل نہ ہوئی۔ راجا کی ماں نے یہ سب اُتارنے میں مدد کی۔ بوجھ اُتارنے کے بعد لالی پھر ہنہناتی اور سرپٹ دوڑ کے واپس راجا کے پاس پہنچ گئی۔ اتنی دیر میں ڈاکو سامان کا آخری گھوڑا لاد چکے تھے۔ گھوڑی دیکھ کر سمجھے اس پر بوجھ لادنا رہ گیا۔ اُنہوں نے گھوڑی کو پکڑا کچھ سامان اس پر پھر سے لاد دیا۔ اور یہ کارواں گھنے

جنگلوں کی طرف چل پڑا۔

راجا کی ماں نے اندر سے لالٹین لائی تو دیکھا کہ گھوڑی نے جو سامان آنگن میں چھوڑ دیا تھا۔ اسمیں چاول کے دو بورے۔ آٹھ دس کلو چینی۔ اور چائے کے چار ڈبے تیل کا ایک چھوٹا پیپہ تھا۔ وہ اللہ کی رزاقی سمجھ کر اندر سے خوش ہوئی۔ اُسے اپنے بھوکے بچوں کا خیال آیا۔ اُسکی آنکھوں میں آنسو آئے۔ اُس نے گھسیٹ گھسیٹ کر بورے اندر لائے۔ چائے۔ چینی اور تیل کچن میں رکھا۔ اُسی وقت چولھا جلایا۔ چاولوں میں دال کے دانے اور نمک ڈال کر پکایا۔ اور بچوں کو جگا کر کھلایا۔ اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ راجا کی ماں نے خود کھانا نہیں کھایا۔ کیونکہ اُسے راجا کی فکر ستائے جا رہی تھی۔ نہ جانے صبح کا بھوکا پیاسا کہاں ہوگا۔ پھر وہ گھوڑی اور سامان کے متعلق سوچتی تو کچھ مطمئین ہو جاتی۔ پوری رات وہ سو نہ سکی اور راجا کی راہ دیکھتی رہی۔

صبح یہ خبر جنگل کے آگ کی طرح پھیل گئی کہ ڈاکوؤں نے پاس والے گاؤں کو لوٹا ہے۔ وہ گاؤں سے لوٹ کے سامان کیساتھ گھوڑے۔ کچھ بھیڑیں۔ اور دو تین لڑکے بھی ساتھ لے گئے۔ اب اس بات میں کوئی شک کی گنجایش نہ رہی کہ راجا اور گھوڑی کو ڈاکو اُٹھا کے لے گئے۔ راجا کی ماں ہاتھ ملتی رہ گئی۔ روتی پیٹتی رہی۔ پڑوسی اُسے دلاسہ دیتے رہے۔ لیکن وہ کسی طرح چپ نہیں ہو رہی تھی۔ اس

سارے ہنگامے کے درمیان وہ گھوڑی کے راشن لانے کی بات زبان پر نہ لائی۔ کیونکہ وہ بچوں کو بھوک سے بلکتے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

اُدھر ڈاکو کے اڈے پر پہنچ کر راجا کا بُرا حال تھا۔ وہ بھوک اور تھکان۔ اور خوف کے مارے گھوڑے سے اُترتے ہی بے ہوش ہوگیا۔ جب اُسکی آنکھ کھلی تو کوئی اُسکے مُنہ میں پانی ٹپکا رہا تھا۔ اُس نے غور سے دیکھا ایک اچھی صورت عورت عجیب لباس پہنے اُسے پانی پلا رہی تھی۔ وہ ایکدم اُٹھ بیٹھا۔ عورت نے پوچھا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے''

راجا نے جواب دیا۔ ''اب ٹھیک ہوں امّاں۔ مجھے تھکان اور بھوک کے مارے غش آگیا عورت نے امّاں کے لفظ سننے پر راجا کو غور سے دیکھا اور بولی۔'' بیٹا ابھی کھانا لاتی ہوں راجا نے کھانا کھایا۔ تھوڑا سا دُودھ پیا۔ اُسکی جان میں جان آگئی۔ اور وہ وہیں فرش پر بے خبر سوگیا۔ شام کو راجا سردار کے سامنے لایا گیا۔ اُس نے راجا سے بہت سے سوال پوچھے۔ راجا نے ہر بات بتادی۔ لیکن اپنے گھر اور گاؤں کا نام نہیں بتایا۔ لہذا سردار نے سمجھا یہ لوٹے گئے گاوں کا ہی ہے سردار کو راجا کی بھولی اور پیاری صورت جیسے بھا گئی۔ اُس نے حکم دیا کہ باقی لڑکوں کو لیجاو۔ اور صرف اس لڑکے کو میرے پاس چھوڑ جاو۔ یہ میرا اور سردارنی کا کام کیا کرے گا۔ اور ساتھ ہی تربیت میں بھی رہے گا۔

راجا کے اصل نام رشید کی جگہ اُسے اب شیدا نام سے پُکارا جانے لگا۔ اور وہ چُپ چاپ اپنا کام کرتا رہا۔ سردار کے پاؤں دباتا۔ حقہ کی چلم بھرتا۔ پانی بھر لاتا۔ لکڑیاں لاتا۔ برتن صاف کرتا اور ساتھ ساتھ ہتھیار جن میں بندوق۔ خنجر۔ تلوار۔ برچھے وغیرہ تھے صاف کر کے رکھ دیتا۔ دھیرے دھیرے سردار کو اسکا کام پسند آنے لگا۔ اور وہ راجہ پر بھروسہ بھی کرنے لگا۔ اور راجا اب سردار سے بات چیت بھی کر لیتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد راجا نے ڈرتے ڈرتے سردار سے عرض کیا ''سردار۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں۔ کیا میں اپنی گھوڑی اپنے ساتھ رکھ لوں۔''

سردار نے کہا۔ ''بے شک۔ تم میری اچھی خدمت کرتے ہو۔ سردارنی بھی تم سے خوش ہے۔ اس لئے انعام کے طور پر تمہیں تمہاری گھوڑی دی جائیگی۔''

سردار کے حکم سے شیدا کو اُسکی گھوڑی مل گئی۔ ادھر راجا خوش اُدھر اُسکی گھوڑی خوش شیدا سردارنی کی آنکھوں کا تارا بنتا گیا۔ وہ اسے اپنے بیٹے کی طرح چاہنے لگی۔ وہ شیدا کو اچھا کھلاتی۔ کام کم کرواتی۔ اور اسکے ساتھ طرح طرح کی باتیں کرتی رہتی۔ اُس نے راجا کو بتادیا کہ سردار کا نام ''بھگا'' ہے۔ اور اُس پر سرکار نے تین لاکھ روپے کا انعام رکھا ہے۔

سردارنی شیدا پر بہت بھروسہ کرنے لگی۔ اُسکا اعتبار اس حد تک بڑھ گیا۔ کہ وہ اُسے ڈاکہ ڈالنے کی بھی خبریں دینے لگی کہ کس گاؤں میں ڈاکہ پڑے گا اور

کب پڑے گا۔ راجا سردار کے تین گھوڑوں اور اپنی گھوڑی کو خوب کھلاتا پلاتا۔ اور کبھی کبھی اپنی گھوڑی پر تھوڑے فاصلے تک سواری کرتا۔ لیکن ڈاکوؤں کے اڈے کے حدود کے اندر ہی۔ وقت گزرتا رہا۔ پانچ مہینے ہو گئے۔ راجا بظاہر اس ماحول سے مانوس ہوتا گیا۔ لیکن اندر سے وہ اپنی ماں اور بہن بھائیوں سے ملنے کیلئے بے تاب تھا۔ اور پنجرے میں بند پنچھی کیطرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اور ایک دن اُسے بھاگنے کا موقعہ ملا۔ کچھ دن بعد ڈاکوؤں نے پلان بنایا کہیں ڈاکہ ڈالنے کا۔ راجا نے سردارنی سے چپکے سے پوچھا۔ ''اماں یہ کہاں جا رہے ہیں'' سردارنی نے اُسے سب کچھ بتا دیا۔ راجا نے سر شام ہی اپنے آپ کو تیار رکھا۔ اُس نے گھوڑوں کو دانہ کھلایا۔ اور اپنی گھوڑی کو کچھ زیادہ ہی کھلایا۔ اُسے تھوڑا تھوڑا یاد تھا کہ وہ کس راستے سے اس اڈے تک آ گئے تھے۔ اِدھر ڈاکو ایک سمت روانہ ہو گئے۔ اُدھر راجا نے اپنی گھوڑی کو لگام لگائی۔ اور سردارنی سے کہا۔ اماّں میں تھوڑی دیر کیلئے گھوڑی پر چکر لگا آؤں۔ اور پھر واپس آ کر کھانا کھائینگے۔ سردارنی نے اجازت دے دی۔

راجا گھوڑی پر چڑھ گیا اور بولا چل لالی۔ اپنے گھر۔ لالی سرپٹ بھاگی۔ اور پھر ایک گھنٹے کے اندر اپنے گاؤں پہنچ گئے۔ یہاں گھر جانے کے بجائے راجا سیدھے دوسرے گاؤں کی پولیس چوکی پر پہنچا۔ اور چوکی آفیسر کو ساری بات بتا دی۔ چوکی آفیسر نے ہیڈ کواٹر خبر پہنچائی۔ ہیڈ کواٹر سے پوری اسلحے کیساتھ نفری گاڑیوں

میں روانہ ہوگئی۔اور جس گاؤں میں ’’بھگا‘‘ ڈاکہ ڈالنے گیا تھا اُس گاؤں کا محاصرہ کرلیا۔ڈاکولوٹ کا سامان گھوڑوں پر لادرہے تھے کہ پولیس نے اعلان کردیا۔ ہتھیار ڈالدو۔ ورنہ مرنے کیلیئے تیار ہوجاو۔ پورے گاؤں کی ناکہ بندی ہُوچکی ہے۔ ڈاکوافراتفری میں بھاگنے لگے۔لیکن جوبھی بھاگتا۔وہ پولیس کی گولی کا شکار ہوجاتا۔اور اسطرح باقی ڈاکوؤں نے ہتھیار ڈالدئے۔ بھگا اکیلا رہ گیا اور مجبوراً اُس نے بھی ہتھیار ڈالدئے۔پولیس کیلیئے یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔اورعوام کیلیئے بہت بڑی راحت۔اور راجا کیلیئے آزادی پولیس کے ڈائرکٹر جنرل نے راجا کی سراہنا کی۔انعام کی رقم اُسے دےدی۔اور احتیاط کے طور پر راجا اور اُسکے گھر والوں کوشہر میں لاکر بسایا۔حالات سدھر گئے۔راجا کے گھر والوں کوغریبی اور بدنصیبی سے نجات ملی۔ وہ بھائی بہن سکول جانے لگے۔لیکن راجا لالی کونہیں بھُولا۔اُس نے D.G پولیس کوگھوڑی تحفہ میں دی۔تاکہ اُس کی اچھی دیکھ بھال ہو۔راجانے دسویں کا امتحان پاس کیا۔اور پولیس میں بھرتی ہوگیا۔اور اسطرح امن اور سکون کی زندگی گزارنے لگ گئے۔ ☆☆

شیر و وفادار کُتا

جانوروں میں سب سے زیادہ وفادار جانور کُتا ہوتا ہے۔ یہ اپنے مالک کیساتھ آخری دم تک وفاداری نبھاتا ہے۔ عام کُتے میں یہ صفت موجود ہے کہ اسکو دھتکارو پھٹکارو۔ یا کسی وقت کھانا مت دو۔ یہ مالک کے دروازے کو نہیں چھوڑتا ہے۔ پھر جس کُتے کو پیار سے پالا جائے۔ جسکا بہت زیادہ خیال رکھا جائے اُسکی تو بات ہی کچھ الگ ہے۔ وہ اپنے مالک کیلئے اپنی جان تک دے دیتا ہے۔ ایسے ہی ایک کُتے کی کہانی کے بہت چرچے رہے۔ اُسکی تصویر ٹیلی ویژن پر دکھائی گئی۔ اُسکا فوٹو اخباروں میں چھاپا گیا۔ اور فوٹو کیساتھ اُسکی وفاداری کی کہانی بھی بیان کی گئی اور جس نے بھی وہ کہانی دیکھی اور سُنی یا پڑھی۔ وہ داد دیتا رہا اور کُتے کی وفاداری اور بہادری پر عش عش کرتا رہا۔

یہ فروری ۲۰۰۵ء کی بات ہے۔ وادی کشمیر میں موسم نے عجیب کروٹ لی۔

آسمان بہت زیادہ ابر آلود ہوگیا۔ اور شدت سے بارش ہونے لگی۔ یہ بارش تقریباً پوری رات جاری رہی۔ آٹھ فروری کو بارش اور برف برستی رہی۔ موسم بہت زیادہ ٹھنڈا ہو گیا۔ لوگ بارش اور برف سے بچنے کیلئے زیادہ تر گھروں میں ہی رہے۔ اور چار بجے شام سے زوروں کی برف باری ہونے لگی۔ اور سات بجے تک تقریباً چار فٹ برف وادی میں جمع ہوگئی۔ برف باری رات بھر چلتی رہی۔ پہاڑی علاقوں میں چار بجے تک کہیں کم کہیں زیادہ سات فٹ سے نو فٹ تک برف باری ہوئی۔ اسی برف باری میں قاضی گنڈ کے کنڈ علاقے میں بہت زیادہ برف گری۔ وہاں کے ایک گاؤں ولٹینگو ناڑ میں دن کے چار بجے برف کا شدید طوفان آیا۔ چشم دید گواہ جو اڑوس پڑوس گاؤں کے رہنے والے تھے۔ کہتے تھے کہ برف گول گول دائروں کی صورت میں ولٹینگو ناڑ گاؤں کے اوپر گر رہی تھی۔ کچھ ہی منٹوں میں پورا گاؤں برف کے نیچے دب گیا۔ مکینوں سمیت مکان دب گئے۔ درخت ٹوٹ کر یا جڑ سے اُکھڑ کر برف میں ایسے دبے۔ جیسے اس گاؤں میں نہ کہیں کوئی مکان تھا، نہ درخت۔ پورا ولٹینگو ناڑ برف کے طوفان میں ایسے دب کر ہموار ہوا جیسے یہاں کبھی کوئی بستی تھی ہی نہیں۔ اللہ میاں نے اپنے قہر کو برف کے طوفانی بلڈوزر میں تبدیل کر کے پوری بستی کو نیست و نابود کر دیا۔ اسی بستی میں رحیم چاچا بھی رہتا تھا۔

رحیم چاچا کی عمر پچاس سال کے قریب تھی۔ اُسکا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ صرف

ایک بیٹی تھی اور وہ طوفان کے وقت پانی لانے گئی تھی۔ اور نہ جانے کہاں برف کے نیچے دب گئی۔ اسکے علاوہ چاچا کے گھر میں ایک بھینس تھی اور شیرو نام کا ایک کُتا تھا۔

بھینس صبح وشام سولہ کلو دُودھ دیتی تھی۔ اور یہی دُودھ اس گھر کے گُزارے کیلئے کافی تھا رحیم چاچا بھینس کو جنگل چرانے لیجاتا۔ اُسے گھاس۔ کھلی۔ بھُوسہ کھلاتا۔ اسکا دُودھ دوہتا اور گاوخانے کو صاف سُتھرا رکھتا۔ یہی اُسکا کام تھا۔

چاچا کا شیرو جسکو اُس نے پچھلے دس سال سے پالا تھا۔ اسکے گھر کی رکھوالی کرتا۔ اور کبھی کبھی بھینس بھی چرانے لیجاتا۔ اور واپس لے آتا۔ شیرو شیر جیسا ہی بہادر تھا مجال ہے کہ چاچا کے آنگن میں کوئی داخل ہو جائے۔ اور شیرو اُسکو داخل ہونے دے۔ یہاں تک کہ دوسرے گھر کی مرغی بھی چاچا کے آنگن میں داخل نہیں ہوسکتی تھی۔ اگر کوئی چاچا کے گھر میں آنا چاہتا۔ وہ باہر والی گلی سے رحیم چاچا کو آوازیں دے دیتا تھا۔ اور جب اندر سے شیرو سے کہا جاتا کہ وہ آنے والے کو اندر آنے دے۔ تب شیرو ایک طرف کو ہٹ کر بیٹھ جاتا۔ اور آنے والا گھر میں داخل ہو جاتا۔ شیرو اپنے مالک کی ہر چیز پہچانتا تھا۔ اور اپنے مالک کی ہر بات سمجھتا تھا۔ اور اُسکا ہر حکم مانتا تھا۔ جیسے وہ کتا نہ ہو بلکہ گھر کا کوئی ذمہ دار فرد ہو۔ رحیم چاچا حکم دیتا کہ شیرو گھر میں بیٹی سارہ اکیلی ہے۔ شیرو گھر پہنچ کر پہرے داری کا کام سنبھالتا۔ بھینس جنگل گئی ہے۔ اُسے واپس لے آ۔ شیرو ایک ہوشیار نوکر کی طرح جنگل سے

بھینس کو لے آتا گھر کی چھوٹی موٹی چیزیں ادھر سے اُدھر لے کر آتا جاتا۔ اس طرح چاچا اور شیرو لازم وملزوم تھے۔ اور اُس طوفانی دن تقریباً دن کے چار بجے کا وقت تھا۔ سارہ گلی کے پبلک پوسٹ نل پر گھڑا لیکر پانی لانے گئی۔ وہ ابھی نل کے پاس پہنچی ہی تھی کہ طوفان نے آن واحد میں ساری بستی کو دبوچ لیا۔ جو جہاں تھا وہیں طوفان میں دب گیا۔ جو کھڑا تھا۔ کھڑا ہی برف میں دب گیا۔ جو گھروں میں تھے وہ گھر دب جانے کیوجہ سے گھروں کے اندر ہی دب گئے۔

شیرو اور چاچا گھر کے اندر تھے۔ اُنکی بھیس بھی گھر میں تھی۔ گھر دب گیا۔ شیرو ایسی جگہ رہ گیا جہاں مکان کا ملبہ شیرو کے اوپر گرنے کے بجائے چھت کی کڑیوں پر گرا جسکے نیچے شیرو رہ گیا۔ اور اُسے بالکل چوٹ نہیں لگی۔ مگر اُسے باہر نکلنے کا ہر راستہ بند تھا۔ اسی طرح چاچا اور اُسکی بھینس بھی اندر تھے نہ معلوم کس حالت میں تھے۔ زندہ تھے بھی یا نہیں۔

یہ قیامت والی رات گزر گئی۔ دوسرے دن دوپہر تک بھی کسی کو پتہ نہ چلا کہ اس بستی پر کیا بیتی پھر پڑوس والے گاؤں والوں کو پتہ چلا کہ یہ بستی پوری کی پوری دب گئی ہے۔ اُنہوں نے کسی طرح فون کے ذریعے اپنے جان پہچان والوں کو اطلاع کر دی۔ اور کسی طرح پولیس سٹیشن قاضی گنڈ تک بات پہنچی۔ پولیس والوں نے ہیڈ کواٹر تک بات پہنچائی۔ نزدیکی آرمی کیمپ کو بھی خبر مل گئی۔ گورنمنٹ بھی

ایک بیٹی تھی اور وہ طوفان کے وقت پانی لانے گئی تھی۔ اور نہ جانے کہاں برف کے نیچے دب گئی۔ اسکے علاوہ چاچا کے گھر میں ایک بھینس تھی اور شیرو نام کا ایک کُتا تھا۔

بھینس صبح وشام سولہ کلو دُودھ دیتی تھی۔ اور یہی دُودھ اس گھر کے گُزارے کیلئے کافی تھا رحیم چاچا بھینس کو جنگل چرانے لیجاتا۔ اُسے گھاس۔ کھلی۔ بھُوسہ کھلاتا۔ اسکا دُودھ دوہتا اور گاوخانے کو صاف سُتھرا رکھتا۔ یہی اُسکا کام تھا۔

چاچا کا شیرو جسکو اُس نے پچھلے دس سال سے پالا تھا۔ اسکے گھر کی رکھوالی کرتا۔ اور کبھی کبھی بھینس بھی چرانے لیجاتا۔ اور واپس لے آتا۔ شیرو شیر جیسا ہی بہادُر تھا مجال ہے کہ چاچا کے آنگن میں کوئی داخل ہو جائے۔ اور شیرو اُسکو داخل ہونے دے۔ یہاں تک کہ دوسرے گھر کی مرغی بھی چاچا کے آنگن میں داخل نہیں ہوسکتی تھی۔ اگر کوئی چاچا کے گھر میں آنا چاہتا۔ وہ باہر والی گلی سے رحیم چاچا کو آوازیں دے دیتا تھا۔ اور جب اندر سے شیرو سے کہا جاتا کہ وہ آنے والے کو اندر آنے دے۔ تب شیرو ایک طرف کو ہٹ کر بیٹھ جاتا۔ اور آنے والا گھر میں داخل ہو جاتا۔ شیرو اپنے مالک کی ہر چیز پہچانتا تھا۔ اور اپنے مالک کی ہر بات سمجھتا تھا۔ اور اُسکا ہر حُکم مانتا تھا۔ جیسے وہ کتا نہ ہو بلکہ گھر کا کوئی ذمہ دار فرد ہو۔ رحیم چاچا حکم دیتا کہ شیرو گھر میں بیٹی سارہ اکیلی ہے۔ شیرو گھر پہنچ کر پہرے داری کا کام سنبھالتا۔ بھینس جنگل گئی ہے۔ اُسے واپس لے آ۔ شیرو ایک ہوشیار نوکر کی طرح جنگل سے

بھینس کو لے آتا گھر کی چھوٹی موٹی چیزیں ادھر سے اُدھر لے کر آتا جاتا۔ اس طرح چاچا اور شیرو لازم وملزوم تھے۔ اور اُس طوفانی دن تقریباً دن کے چار بجے کا وقت تھا۔ سارہ گلی کے پبلک پوسٹ نل پر گھڑا لیکر پانی لانے گئی۔ وہ ابھی نل کے پاس پہنچی ہی تھی کہ طوفان نے آن واحد میں ساری بستی کو دبوچ لیا۔ جو جہاں تھا وہیں طوفان میں دب گیا۔ جو کھڑا تھا۔ کھڑا ہی برف میں دب گیا۔ جو گھروں میں تھے وہ گھر دب جانے کیوجہ سے گھروں کے اندر ہی دب گئے۔

شیرو اور چاچا گھر کے اندر تھے۔ اُنکی بھیس بھی گھر میں تھی۔ گھر دب گیا۔ شیرو ایسی جگہ رہ گیا جہاں مکان کا ملبہ شیرو کے اوپر گرنے کے بجائے چھت کی کڑیوں پر گرا جسکے نیچے شیرو رہ گیا۔ اور اُسے بالکل چوٹ نہیں لگی۔ مگر اُسے باہر نکلنے کا ہر راستہ بند تھا۔ اسی طرح چاچا اور اُسکی بھینس بھی اندر تھے نہ معلوم کس حالت میں تھے۔ زندہ تھے بھی یا نہیں۔

یہ قیامت والی رات گزر گئی۔ دوسرے دن دوپہر تک بھی کسی کو پتہ نہ چلا کہ اس بستی پر کیا بیتی پھر پڑوس والے گاؤں والوں کو پتہ چلا کہ یہ بستی پوری کی پوری دب گئی ہے۔ اُنہوں نے کسی طرح فون کے ذریعے اپنے جان پہچان والوں کو اطلاع کر دی۔ اور کسی طرح پولیس سٹیشن قاضی گنڈ تک بات پہنچی۔ پولیس والوں نے ہیڈ کوا ٹر تک بات پہنچائی۔ نزدیکی آرمی کیمپ کو بھی خبر مل گئی۔ گورنمنٹ بھی

خبردار ہوگئی۔ امدادی کاروائی کا فوری طور حکم دیا گیا۔لیکن دس گیارہ فٹ اُونچی برف میں سے راستہ بنانا۔دبی بستی کا پتہ لگانا۔بہت مشکل کام تھا۔

امدادی کاروائی کیلئے پولیس ۔فوج۔رضا کار ٹیمیں ۔میڈیکل ٹیمیں۔ ریڈکراس ۔اڑوس پڑوس گاؤں کے لوگ ۔لیکن بڑی مُشکل سے وہ کام کر رہے تھے۔دبے مکانوں میں زندہ لوگ ڈھونڈ نا۔ بڑا مشکل ہو رہا تھا۔اتنے لوگ ہونے کے باوجود راحت رسانی میں تاخیر ہو رہی تھی۔

اب تک دس دن ہوگئے تھے۔اب کچھ رستے سے بن گئے تھے جہاں سے گزر کر لوگ دبے مکانوں کے پاس جا کر ملبے سے زندہ یا مُردہ انسانوں کی تلاش کر رہے تھے۔اسی دوران مزید امدادی ٹیمیں پہنچ رہی تھیں ۔کام کی نگرانی پولیس اور آرمی کے بڑے بڑے آفیسر کر رہے تھے۔آفیسر لوگ ایک جگہ کھڑے جوانوں کو ہدایات دے رہے تھے کہ ایک لاغر کُتا دم ہلاتا ہوا اُنکے پاس آیا۔ کُتا بڑے آرمی آفیسر کے کوٹ کا دامن پکڑ کر کھینچنے لگا۔آفیسر نے کُتے کو ڈانٹ پلائی ۔کُتے نے کوٹ کا دامن چھوڑا۔اور اپنے اگلے پنجوں سے آفیسر کے جوتے پکڑ لئے ۔اور سر اُنکے قدموں میں ڈالدیا۔آفیسر نے کُتے کو پھر ڈانٹا۔کُتے نے جوتے چھوڑ دے۔ اس نے آفیسر کے سامنے اپنی پچھلی ٹانگوں پر بیٹھ کر اگلے دونوں پنجے جوڑ لئے۔گویا التجا کر رہا ہو۔اور کسی بات کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔اب بات سب کی سمجھ میں آگئی

کہ کتا کسی خاص بات کی طرف توجہ چاہتا ہے۔

آفیسر نے کُتے سے کہا۔ کیا بات ہے۔

کُتا آفیسر کے کوٹ کا دامن پکڑ کر کھینچنے لگا۔ اور چلنے کیلئے مجبور کیا۔ کُتا آگے آگے۔ آفیسر پیچھے اور باقی لوگ اُنکے پیچھے چلتے گئے۔ کتا اپنے مالک کے دبے گھر کے سامنے پہنچ گیا یہاں پہنچ کر آرمی والوں کو برف میں ایک سرنگ سی دکھائی دی۔ جسمیں سے گزر کر یہ کُتا نکل آیا تھا۔ سپاہی اُسی سرنگ کی سیدھ میں برف ہٹاتے گئے۔ آگے اُنہیں مکان کا برآمدہ دکھائی دیا۔ وہ برف ہٹاتے گئے۔ ملبے کو ہٹایا تو ایک کونے میں ایک بھینس ٹوٹی دیوار کیساتھ دُبکی تھی۔ مگر زندہ تھی۔ اُسکو جوں توں کر کے باہر نکالا۔ کُتا پھر آگے جانے کا اشارہ کرنے لگا۔ برف اور ملبہ ہٹایا گیا۔ تو اندر کسی آدمی کے پاؤں دکھائی دئے۔ اب لوگ آہستہ آہستہ ملبہ اُٹھانے لگے۔ یہاں تک کہ آدمی کو برف سے باہر نکالا گیا۔ وہ سردی سے سُن ہو گیا تھا۔ لیکن اُسکا دل ہلکے سے دھڑک رہا تھا اور کمزور سی سانس چل رہی تھی۔ اسٹریچر پر آدمی کو لٹایا گیا اور میڈیکل کیمپ تک لے جایا گیا۔ اُسکا کُتا اُسکے پیچھے پیچھے تھا۔

ڈاکٹروں کی مُسلسل کوششوں اور طبی امداد کے بعد تیسرے دن اس آدمی کو ہوش آیا۔ اسکا جسم جگہ جگہ سے چُور تھا۔ اور پورے جسم پر پٹیاں بندھی تھیں۔ لیکن وہ کُتا اب بھی اسکے سرہانے بیٹھا آنسو بہا رہا تھا۔ اور سب لوگ اسکی وفاداری کی داد

دے رہے تھے۔ اوراسی لئے اخباروں میں اُسکی تصویر چھپی اور ٹی وی پر بھی اُسکی کہانی تصویروں کیساتھ دکھائی گئی۔ ☆☆

وحشی جانور بھی احسان مانتے ہیں

بہت پہلے کی بات ہے۔ جب بجلی سے چلنے والے آرے یعنی بینڈ سا نہیں ہوا کرتے تھے۔ تب جنگل میں ہی بڑے بڑے درخت کاٹنے کے بعد اُنہیں آرے سے چیرتے تھے۔ اور وہاں سے گدھوں۔ گھوڑوں پر لاد کر گاؤں یا شہر لایا کرتے تھے۔ تب یہ ٹرک اور ٹپر بھی نہیں ہوا کرتے تھے۔ بار برداری کا سارا کام گھوڑا گاڑی۔ بیل گاڑی یا گدھوں گھوڑوں سے لیا جاتا تھا۔ بڑی مُشکلوں اور مشقتوں سے لوگ یہ کام انجام دیا کرتے تھے۔ اُنہیں دنوں کی بات ہے کہ ایک ٹھیکے دار نے جنگل میں درخت کٹوانے اور اُنکی چیرائی کیلیئے بہت سے مُزدور اور آرے والے کام پر لگا رکھے تھے۔ بڑے بڑے لٹھ سہاروں کے ذریعے کھڑے کروائے جاتے اور دو آدمی آرہ لیکر اُن کو چیرتے رہتے تھے۔ اسطرح چیرنے کیلیئے آرئے کو دونوں طرف سے اڑاو یعنی لکڑی کا فریم سا لگا ہوتا تھا تا کہ چیرنے والے آسانی سے پکڑ سکیں اور چیرتے چیرتے آرہ ہل نہ جائے اور لکڑی خراب نہ ہو جائے۔ اور سہاروں کے ذریعے کھڑا کئے ہوئے لٹھ کے اوپر ایک آدمی اور لٹھ کے

نیچے دوسرا آدمی ہوا کرتا تھا۔ اور دونوں لکڑی کے دستے کو پکڑا کر آرے کو اوپر نیچے کھینچتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ لٹھ دو پھاڑوں میں چیر جاتا اور اسکے شہتیر۔ بن جاتے، پھر ان شہتیروں سے بھی کڑیاں بنانے کیلئے پھر سے کھڑا کر کے چیرتے رہتے۔ اور ایسا کرتے ہوئے آرے کو تیز چلانے کیلئے اور کام میں آسانی کیلئے تھوڑا سا چیر کر آرے والے لٹھ میں لکڑی کی ایک اوپر سے موٹی، لمبی بڑی سی مستطیل میخ (پوٚن) بنا کر ٹھونس دیتے۔ اس سے چیرے ہوئے حصے تھوڑا دُور دُور رہتے اور آری تیز چلتی تھی۔ جتنی چیرائی آگے بڑھتی۔ میخ کو نکال کر آگے آگے ٹھونستے جاتے تھے۔

ایک دن شام کے وقت مزدور جب گھر جانے لگے۔ تو چیرائی کرنے والوں کو لٹھ کی چیرائی ادھوری رہ گئی۔ اُنہوں نے آدھا چیرا ہوا لٹھ یوں ہی چھوڑ دیا۔ اسمیں بڑی میخ بھی لگی تھی۔

دوسری صبح جب سب لوگ کام پر واپس آئے۔ تو یہ دیکھ کر کچھ حیران وپریشان اور کچھ گھبرا گئے۔ کیونکہ آدھے چیرے ہوئے لٹھ پر اُنہیں ایک ریچھ بیٹھا ہوا ملا۔ ریچھ لوگوں کو دیکھ کر خوفزدہ اور لوگ ریچھ کو دیکھ کر خوفزدہ۔ نہ ریچھ ہٹتا تھا۔ نہ لوگ آگے بڑھتے تھے۔ تھوڑی دیر تک یہ حالت طاری رہی۔ پھر ذرا لوگوں کے حواس درست ہوئے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ ریچھ اپنا بایاں ہاتھ اُٹھا کے مُنہ

سے ''اُوں'' کی لمبی آواز نکال کے جیسے کچھ کہنے کہ کوشش کر رہا تھا۔ مزدورں میں سے ایک بہادر مزدُور جمال ڈار آگے بڑھا۔ ہاتھ میں بڑی سی کلُہاڑی لی۔ اور اُس کھڑے لٹھ کے پاس کلُہاڑی اُوپر اُٹھائے چلا آیا۔ لیکن ریچھ اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔

جمال ڈار اور آگے بڑھا۔ تب اُسے دکھائی دیا کہ ریچھ کا دائیاں ہاتھ لٹھ کے دو پھاڑوں کے بیچ میں پھنسا تھا۔ کیونکہ لٹھ کے پھاڑوں میں جو میخ گاڑھی گئی تھی وہ شاید ریچھ نے بائیں ہاتھ سے نکال پھینکی تھی۔ ایک طرف ریچھ کو دائیاں ہاتھ لٹھ میں پھنسا ہونے سے تکلیف تھی دوسری طرف موت کا ڈر تھا۔ اور شاید وہ اسی لئے اپنا بایاں ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر مُنہ سے درد بھری آواز نکال کر مدد طلب کر رہا تھا۔

جمال ڈار آگے بڑھا۔ اُس نے لکڑی کی میخ اُٹھائی اور کلُہاڑی سے لٹھ کے چیر میں زور سے ٹھونس دی۔ لٹھ کے پھاڑ الگ ہونے لگے اور ریچھ کی تکلیف کم ہونے لگی تھوڑی دیر کے بعد اتنی جگہ بن گئی کہ وہ اپنا ہاتھ باہر نکال پایا۔

ہاتھ باہر نکل گیا۔ ریچھ نے درد والے ہاتھ کو بائیں ہاتھ سے اُٹھایا۔ اور لٹھ سے نیچے اُتر گیا۔ تھوڑی دُور جا کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اور مزدور دیکھتے رہے کہ کسطرح ریچھ اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ سے سہلاتا رہا۔ دباتا رہا۔ یہاں تک کہ ہاتھ میں جان آگئی۔ اور وہ وہاں سے چلا اور مزدُور اپنے کام میں پھر سے لگ گئے۔

ایک دو گھنٹوں کے بعد کیا دیکھتے ہیں۔ کہ وہی ریچھ اپنے سر پر ایک بڑا سا درخت اُٹھائے پچھلی ٹانگوں پر کھڑا اچل کر آرہا ہے۔ مزدُور پھر سے گھبرا گئے۔ اور پریشانی میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ جمال ڈار نے مزدُوروں کو روکا۔ اور اپنی جگہ تیار رہنے کو کہا۔ ریچھ اب صرف پچاس فٹ کی دُوری پر تھا۔ اُس نے سر سے آہستہ آہستہ بوجھ اُتار دیا۔ اُسے نیچے رکھ کر خود پیچھے ہٹ گیا اور دُور سے تماشہ دیکھنے لگا۔ مزدُوروں نے دیکھا کہ ریچھ اپنے سر پر درخت نہیں۔ درخت کا خول اُٹھالایا تھا۔ اوراس خول پر شہد کی مکھیاں منڈلا رہی تھیں۔

جمال ڈار کمال جُرأت سے آگے بڑھا۔ دیکھا تو اس خول میں شہد بھرا تھا۔ اُس نے سب کو بُلایا۔ سب نے جی بھر کے شہد کھایا۔ اور اپنے برتنوں جسمیں وہ کھانا ساتھ لائے تھے۔ اُسمیں شہد بھرا۔ اس طرح ریچھ نے اُسکے ساتھ کئے گئے نیک سلوک کا بدلہ دیا۔ جب شہد سے سب کے برتن بھر گئے۔ اور سب واپس اپنے کام میں لگ گئے۔ تو ریچھ قریب آیا۔ اور اس خول میں سے بچا کچھا سارا شہد کھالیا۔ اور جنگل کی راہ لی۔ اور تب لوگ سمجھ گئے کہ نیکی اور احسان جنگل کے وحشی جانور بھی بھلاتے نہیں۔ اور نیکی کا بدلہ ہمیشہ نیک ہی ہوتا ہے۔ ☆☆

گیدڑ اور کُتے

بچّو! ہزاروں سال پہلے کی بات ہے۔ کہ یہ جو کُتے بستیوں میں پھر رہے ہیں یہ جنگلوں میں رہا کرتے تھے۔ اور گیدڑ بستیوں میں رہا کرتے تھے۔ بستیوں میں رہنے کے باوجود گیدڑ بستیوں میں رہنے کے لایق نہ تھے۔ اپنے وحشی پن کی وجہ سے اُنہوں نے لوگوں کا جینا مُشکل کر دیا تھا۔ وہ لوگوں کے مُرغے کھا جاتے تھے۔ بھیڑ بکریوں کے نہ صرف بچے بلکہ کبھی کبھی بھیڑ بکریاں چٹ کر جاتے تھے۔ ادھر انسان کی نظر چُوکی۔ اُدھر میمنہ غائب۔ ادھر آدمی ذرا بھی غافل ہوا۔ گائے گھوڑے کے بچھڑے بھی چیر پھاڑ کر کھا جاتے تھے۔ لوگ بہت پریشان تھے۔ پھر ایک بار ساری بستی جمع ہوگئی۔ اُنہوں نے مشورہ کیا کہ اس مُصیبت سے کیسے چھٹکارا پالیں گے۔

بزرگوں نے کافی سوچ وچار کے بعد مشہورہ دیا کہ تمام لوگ۔ کُلہاڑیاں۔ لاٹھیاں لیکر ان گیدڑوں کے پیچھے پڑ جاو۔ انہیں اتنا تنگ کرو کہ یہ بستی چھوڑ کر جنگل کی طرف بھاگ جائیں۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ سب مل کر ان گیدڑوں کے پیچھے

پڑ گئیے۔ کچھ گیدڑ اس مارا ماری میں مارے گئے۔ کچھ اس طرح پٹے کہ ہلنے کی سکت نہیں رہی۔ لیکن لوگ تھے کہ پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ انہیں کہیں ٹھہرنے نہیں دیتے تھے۔ اور پیچھا کرتے کرتے گیدڑوں کو جنگل کی طرف دھکیل دیا۔ گیدڑ جب جنگل پہنچے۔ تو ذرا چین کی سانس لی۔ لیکن جب اُنہوں نے دم سنبھالا۔ یہاں کتے اُنکو اپنے دُشمن دکھائی دئے۔ اور کچھ اپنے گزارے کا سامان بھی لگا۔ اُنہوں نے کتوں پر حملہ شروع کیا۔ بہت سارے کتوں کو مار ڈالا اُنکے بچوں کو چٹ کر گئے۔ اپنی غذا کیلئے وہ کُتوں کو مارتے رہے۔

اب کُتے پریشان کہ اس بلا سے کیسے جان چھوٹے۔ اگر کچھ دن ایسے ہی گزرے تو یہ گیدڑ ہماری نسل کو ہی ختم کر دینگے۔ کُتوں نے ایک جگہ جمع ہو کر مشورہ کیا اب کیا کیا جائے۔ کیسے اس مُصیبت سے نجات پائیں۔ پھر سب نے ایک زبان ہو کر یہ رائے دی کہ ہم کو جنگل چھوڑ کر بستی کی طرف رُخ کرنا چاہئے۔ اسی میں ہماری سلامتی ہے۔ اور اس مشورے پر فوراً عمل ہوا۔ اور راتوں رات کتے جنگل چھوڑ کر بستی کی طرف روانہ ہوئے صبح جب گاؤں والے نیند سے بیدار ہوئے۔ تو اُنہوں نے گلیوں میں گھر کے آنگنوں میں کُتّوں کو دیکھا۔ پہلے تو وہ گھبرا گئے اور باہر نکلنے اور چلنے پھرنے سے احتراز کرنے لگے۔ لیکن کتے آدمیوں کو دیکھ کر ایک طرف ہٹ جاتے اور چپ چاپ کھڑے رہتے۔ آدمی اِدھر اُدھر گھومنے

پھرنے لگے۔لیکن کتوں نے بالکل نہیں چھیڑا۔نہ کسی جانور کو ستایا۔نہ خوراک کیلئے کسی جانور پر جھپٹے۔ بلکہ بھوک کے مارے گلیوں میں بکھری گندگی کو چاٹنے لگے۔ اناج روٹی کے بکھرے ٹکڑوں کو کھانے لگے۔ کہیں کوئی مرا ہوا جانور دیکھا تو اس کو کھانے لگے۔اور اسطرح ماحول میں صفائی بھی ہوتی رہی۔ بدبو بھی کم پھیلی۔اور لوگ سمجھ گئے کہ کُتے اگر شکل صورت میں گیدڑوں سے ملتے جُلتے ہیں۔لیکن یہ بے ضرر ہیں۔اب آدمی ان سے بالکل نہیں ڈرتے تھے اور نہ انکو ستاتے۔

رفتہ رفتہ کُتے بستی والوں سے مانوس ہونے لگے۔جو کُتا جس آنگن میں گیا وہیں رہنے لگا۔گھر والوں کو دیکھ کر دُم ہلاتا۔ پیچھے پیچھے آتا۔جو کچھ ملتا۔جتنا ملتا اُسی پر گزارہ کرتا۔لیکن گھر والے کے دروازے سے لگ کر بیٹھتا۔رات کو ذرا سی آہٹ ہوتی تو بھونکتا رہتا۔اسطرح چوکیداری کے فرایض انجام دیتا۔کسی اجنبی کو گھر کی طرف آتے دیکھتا تو بھونکنے لگتا۔اسطرح گھر والے ہوشیار ہوجاتے اور انہیں پتہ چل جاتا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔

گھر کا مالک ریوڑ چرانے لیجاتا۔کُتا ساتھ جاتا اور ریوڑ جب چرنے لگتا۔ کُتا ریوڑ کے اردگرد چکر لگاتا۔اور اگر کوئی جانور مثلاً۔ریچھ۔شیر۔بھیڑیا۔گیدڑ۔ وغیرہ دیکھتا تو بھونک کر مالک کو ہوشیار کرتا۔اور ریوڑ کو بھونک کر دوڑ کر اُدھر سے ہٹنے کا اشارہ کرتا۔اسطرح مالک کا نقصان ہونے سے بچ جاتا۔

گھر میں کوئی نہیں ہوتا تو کُتا گھر کی رکھوالی اچھی طرح کرتا۔ کسی چور اُچکے کو گھر کی طرف بڑھنے سے روکتا اور بھونک بھونک کر پڑوسی تک ہوشیار ہو کر چور کا پیچھا کرتے۔ کتا مالک کے مرغوں کی رکھوالی کرتا بھیڑ۔ بکریوں کی رکھوالی کرتا۔ گائے بھینس کی رکھوالی کرتا۔ گھر کی رکھوالی کرتا۔ اسطرح آدمیوں پر کام کا دباؤ کم رہتا اور کچھ سکون وچین مل جاتا۔

کتوں میں ایک صفت یہ بھی پائی جاتی ہے کہ وہ مالک کی زبان سمجھ لیتے ہیں۔ اشارے سمجھ لیتے ہیں اور ویسا ہی کرتے ہیں جیسا مالک چاہتا ہے۔ سب سے بڑی صفت اسکی یہ ہے کہ وہ بڑا وفادار جانور ہے۔ چاہے کم کھائے چاہے زیادہ مالک سے بے وفائی نہیں کرتا۔ اپنے مالک کیلئے اپنی جان دینے کیلئے تیار رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ کتوں کو بڑے پیار سے پالتے ہیں۔ ان پر ہزاروں روپے خرچ کرتے ہیں۔

کتوں میں ایک اور صلاحیت بھی ہے۔ کہ وہ بو سونگ لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے پولیس اور فوج میں کُتے سراغ رسانی کے کام کیلئے پالے جاتے ہیں۔ کتے راستوں کو نہیں بھولتے ایک بار کہیں سے گزر جائیں تو ہمیشہ کیلئے یاد رکھتے ہیں۔ سائنسدانوں نے خلاء میں سب سے پہلے کُتے کو ہی بھیجا تھا۔ تاکہ تحقیق کر سکیں کہ خلاء میں زندہ کتے پر کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ کُتا جب صحیح سلامت لوٹا تو

سائنسدانوں کی حوصلہ افزائی ہوئی اور آئیندہ خلائی سفر پر آدمی گیا۔

ادھر کچھ مدت تک گیدڑ جنگل میں آرام سے رہے اور اپنی جان بچ جانے پر شکر کرتے رہے لیکن جلد ہی اُنکو احساس ہو گیا کہ جنگل میں اُنکو خوراک کی کتنی پریشانی ہے۔ اپنے سے زیادہ طاقتور جانوروں جیسے۔ شیر۔ چیتا۔ تیندوا۔ وغیرہ کا خطرہ تو لگا ہی رہتا تھا۔ اب اُنکو بستی میں بسنے کے دن یاد آنے لگے۔ اور وہ سمجھ گئے کہ اُنکی بے وقوفیوں اور زیادتیوں کی وجہ سے انہوں نے انسان کو اپنا دُشمن بنالیا۔

گیدڑوں کو جب بھوک ستاتی ہے تو وہ جنگل سے نکل کر بستیوں کا رُخ کرنے لگتے ہیں۔ اب گیدڑ جب بھی بستی کی طرف آنے لگتے اور ہانک لگا کر گیدڑوں کو بُلاتے۔ خاص کر شام کے اندھیرے میں اور صبح روشنی ہونے سے پہلے۔ تو کُتے اُنکی آواز سُن کر بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ اور انکی طرف دوڑنا شروع کرتے ہیں۔ اور اس کام میں آدمی بھی اُنکا ساتھ دیتے ہیں۔ کیونکہ جب گیدڑ بستی کے قریب آتے ہیں تو وہ مرغوں یا بھیڑوں پر ہاتھ صاف کر ہی جاتے ہیں۔ لہذا گیدڑوں کی آواز سُن کر لوگ بھی تیار رہتے ہیں۔

گیدڑوں کا معمول ہے وہ اندھیرا ہوتے ہی بستی کی طرف آوازیں لگاتے ہوئے آتے ہیں۔ گویا کتوں کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہم آرہے ہیں۔ لیکن کتے ہوشیار ہو کر بھونک کر اُنکی طرف دوڑ لگاتے ہیں۔ اور گیدڑ پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ اسطرح

کُتے یاد دلاتے ہیں کہ ہمارے ہوتے ہوئے تم لبستی کیطرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔اور صدیوں سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے اور چلتا رہے گا۔

سرمایہ

لوگ دولت ۔ سونے چاندی اور زمین جائیداد کو سرمایہ کہتے ہیں ۔ اور اسکے بل بوتے پر کچھ بھی کر سکتے ہیں ۔ اچھے سے اچھا کھاتے ہیں ۔ اچھا پہنتے ہیں ۔ حویلی کوٹھیوں میں رہتے ہیں ۔ خدمت کیلئے نوکر چاکر ۔ گھومنے پھرنے کیلئے موٹر گاڑیاں ۔ خرچ کرنے کیلئے جیب روپیوں سے بھری ہوتی ہے ۔

لیکن یہ سب ظاہری آسائشیں ہیں ۔ اور یہ کبھی بھی ختم ہو سکتی ہیں ۔ سونا چاندی ۔ روپے پیسے ایسی چیزیں ہیں جنہیں چور چُرا سکتا ہے ۔ مکان دوکان میں اگر آگ لگ جائے ۔ تو سب خاکستر ۔ اگر پیسہ پاس نہ ہو تو نوکر چاکر ۔ گاڑی موٹر سب چھن جاتے ہیں ۔ آدمی ایک ایک پیسے کیلئے محتاج ہو جاتا ہے ۔

ایسی ہی ایک کہانی سرمایہ ہے ۔ یہ سکول کے دنوں سے شروع ہوئی ، دو دوستوں کی ہے ۔ جنمیں سے ایک سورج بن کر چمکا اور دوسرا بُری سنگت کی وجہ سے برباد ہوا ۔

ایک گاؤں تھا ۔ جسکا نام خیر پور تھا ۔ وہاں ایک چودھری صاحب رہا کرتے تھے بڑے امیر تھے ۔ زمین جائیداد ۔ کوٹھی بنگلہ ۔ گاڑی ۔ گھوڑے نوکر چاکر

سب کچھ تھا اُن کے پاس۔ جدھر سے گزرتے لوگ جُھک جُھک کر سلام کرتے۔ اور اگر وہ کچھ بولتے تو لوگ حکم سرکار حکم سرکار کہتے تھکتے نہیں تھے۔ جسکو بُلاتے مُنہ کے بل چلا آتا۔ اور باادب نظریں جھکائے سامنے کھڑا رہتا۔ اور جو حکم ملتا۔ فوراً بجا لاتا۔

چودھری کے تین بیٹے تھے۔ بڑا دسویں پاس کر کے ٹھیکداری کا کام کرتا تھا اور عیش وعشرت میں اپنے دن رات بسر کرتا۔ دوسرا بالکل پڑھا لکھا نہ تھا۔ صرف سیر وشکار کا شوقین۔ گھر سے صبح نکلتا اور رات گئے واپس آجاتا۔ کبھی ہفتوں کے بعد ہی گھر آجاتا تیسرا چھوٹا۔ گاؤں کے پرائمری سکول جاتا۔ عمر آٹھ نو سال کی۔ ناز ونعمت میں پلنے والا۔ مگر تھا بڑا تنک مزاج۔ دوسروں کی بالا دستی پسند نہیں کرتا۔ وہ سکول گھوڑے پر آتا۔ نوکر ساتھ ہوتا۔ جو گھوڑا واپس لے جاتا۔ اور چھٹی کے وقت پھر حاضر ہوتا اور لڑکے کو گھر لے جاتا۔ دوپہر کو گھر سے نوکرانی کھانا لیکر آتی۔ پھر سلیقے سے دستر خوان بچھاتی اور قسم قسم کے پکوان زبردستی کھلاتی۔ اور لڑکا چودھری اشرف بڑی مشکلوں سے کھانا کھانے کیلئے راضی ہو جاتا۔

اشرف کی جماعت میں ایک دوسرا لڑکا بھی تھا۔ جسکا نام سلیم تھا۔ وہ ایک عام سے غریب کسان گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ روز صبح اپنے گھر سے دوپہر کیلئے اپنے ساتھ روکھی، سوکھی روٹی لے آتا۔ اور عام قسم کی سبزی ترکاری جو ایک عام

سے غریب گھرانے میں بنتی تھی ساتھ ہوتی۔اُسکا کھانا ایک ڈبے میں ہوتا۔اور ایک بوتل میں گھر میں بلوئی چھاچھ ہوتی۔ جواسکی پیاس بھی بجھاتی اور کھانے کیساتھ بھی پی لی جاتی۔

سکول کے اُستاد چودھری کے بیٹے اشرف پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔لیکن پڑھائی کی طرف زیادہ دھیان سلیم کا ہوتا تھا۔جو کچھ ٹیچر پڑھاتے اور سکھاتے وہ سلیم کیلیئے پتھر کی لکیر بن جاتا۔اور ہر سال امتحان میں پہلی پوزیشن سلیم حاصل کرتا۔ یہ بات اشرف کو اور زیادہ تکلیف دیتی اور وہ اندر ہی اندر سلیم سے جلتا بھی تھا۔

پھر ایک دن عجیب بات ہوگئی۔اشرف گھر سے کچھ کھائے پیئے بغیر سکول آگیا تھا۔دوپہر کے کھانے میں ابھی بہت وقت باقی تھا۔اشرف کو بہت بھوک محسوس ہورہی تھی۔لیکن کھانے کے قابل کوئی چیز پاس نہیں تھی۔وہ بے قرار ہورہا تھا۔سلیم سے اُسکی بے قراری پوشیدہ نہ رہی اُس نے دھیرے سے اشرف سے پوچھا کیابات ہے۔''اتنے بے قرار کیوں ہورہے ہو؟

اشرف نے جواب دیا۔بڑے زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔''

سلیم نے کہا۔یہ لومیرا ڈبہ اور یہ بوتل۔اگر اسمیں سے کچھ کھاسکو تو کھاؤ''

''مگرتم کیا کھاوگے۔''

''اگرتم کھاسکوتو کھاو۔میری فکر مت کرو''

اشرف ڈبہ اور بوتل لیکر باہر آگیا۔ اور بڑے مزے اور سکون سے کھانا کھانے لگا۔ اُسے یہ کھانا اتنا لزیز اور مزے دار لگا کہ وہ سارا ڈبہ خالی کر بیٹھا۔ اور بوتل میں سے چھاچھ مزے لے لے کر پی رہا تھا۔

سلیم تھوڑی دیر کے بعد کلاس سے باہر آیا۔ اشرف نے کھانا ختم کیا تھا۔ اور وہ بڑا پرسکون اور خوش دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سلیم کی طرف لپکا اور اُسکا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر بولا

''یار سلیم تمہاری اماں مزے دار کھانا بناتی ہے''

''ہاں یار''

''اب تم کیا کھاوگے''

''میرا آج کا کھانا تمہاری خوشی کے نام۔ میری فکر مت کرو۔ میں بھوکا بھی رہ سکتا ہوں۔''

دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کلاس میں داخل ہوگئے۔ جب کھانے کا وقفہ ہوا تو اشرف کی نوکرانی کھانا لیکر آگئی۔ دستر خان بچھایا۔ پکوان سجائے اور اشرف کو پکڑ کر لائی۔ اشرف نے دیکھا سلیم اکیلا دُور کھڑا ہے۔ وہ دوڑ کر گیا۔ سلیم کا ہاتھ پکڑ کر اسکو دستر خوان پر لے آیا۔ اور نوکرانی سے کہا کہ سارا کھانا اس کیلئے پروس دو۔ نوکرانی حیران کہ کیا کرے۔ لیکن اشرف کی ضد اور ہٹ کا خیال کر کے وہی کیا جو

اُس نے کہا۔

سلیم نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ اتنا عمدہ اور لزیز کھانا اُس نے شاید اپنی عمر میں پہلی بار کھایا تھا۔ دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ ایک ہی دستر خوان پر اشرف سلیم کا کھانا کھا رہا تھا۔ اور سلیم اشرف کا۔ اور نوکرانی حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ اشرف کسی طرح یہ سادہ سا روکھا سوکھا کھانا مزے لے لے کر کھا رہا تھا۔ اُس نے گھر جا کر مالکن کے ڈانٹ کے خوف سے زبان تک نہیں کھولی۔ پھر دونوں کا معمول ہو گیا۔ اکھٹے کھانا کھانا مِل بانٹ کر کھانا۔ مزے لے لے کر کھانا۔ وہ کب گہرے دوست بن گئے پتہ بھی نہیں چلا۔

سکول کے دن ختم ہوئے۔ سلیم نے اپنی پہلی پوزیشن برقرار رکھی۔ پھر وہ قصبے کے ہائی سکول میں گئے۔ میٹرک پاس کیا۔ سلیم ضلع بھر میں اول آ گیا۔ اور اب کالج پہنچ گئے۔ پڑھائی کا سلسلہ جاری رہا۔ اشرف کھیل کود میں زیادہ دلچسپی لے رہا تھا اور سلیم کھیل کود کیساتھ پڑھائی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ کالج کے چار سال کیسے بیتے کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ سلیم کی قابلیت کا لوہا اُسکے اُستاد بھی مانتے تھے اور ایک بار اُسکے انگریزی کے پروفیسر نے سلیم سے کہا تھا۔

''سلیم مجھے تمہارے اندر ایک ذہین آفیسر دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے میرا مشورہ ہے تم گریجویشن کے بعد I.A.S کر لینا۔''

یہ بات سلیم نے اپنی گرہ میں باندھ لی۔ اور جب B.A کے رزلٹ آئے تو سلیم پورے صوبے میں اول آیا تھا۔ اور اشرف بھی گریجویٹ ہو گیا۔

سلیم کو I.A.S کی کوچنگ کیلئے دہلی جانا پڑا۔ لیکن اُسکے والدین کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا وہ چودھری جی کے پاس قرض لینے کی خاطر گئے۔ بڑے چودھری کو یہ برداشت نہ ہوا کہ اُسکے گاؤں کا ایک معمولی کسان اپنے بیٹے کو دہلی I.A.S کرنے کیلئے بھیج رہا ہے۔ لیکن دوسری طرف اُسے اس بات سے سکون ملا۔ کہ کسان اپنی زمین اُسی کے پاس گروی رکھ رہا ہے۔ چودھری اکثر کسانوں کو قرضے دیکر اُنکی زمین گروی رکھتا تھا۔ اور قرضہ ادا نہ ہونے کی صورت میں زمین ہڑپ کر جاتا تھا۔ اُس نے سلیم کے والد کو ۲۰ ہزار روپے قرض دے اور اُسکی زمین گروی رکھ لی۔

سلیم کے دہلی جانے کے بعد اشرف کے معمولات تبدیل ہو گئے۔ وہ سیر شکار کا شوقین بن گیا اُسکی سنگت چاپلوس قسم کے لوگوں کیساتھ لگ گئی۔ وہ چکنی چپڑی باتیں کر کے اشرف کو اپنے جال میں جکڑے رہتے۔ اور اسکی دولت سے عیش کرتے رہتے۔ رفتہ رفتہ اشرف میں وہ ساری بُرائیاں آگئی جو ایک بگڑے ہوئے امیر زادوں کا خاصہ ہوتی ہیں۔ وہ اپنے ان آوارہ دوستوں کیساتھ اکثر شہر چلا جاتا اور ہفتوں واپس آنے کا نام نہیں لیتا۔ اور وہاں شراب۔ ہوٹل پر ہزاروں

روپے برباد کردیتا۔ رفتہ رفتہ اسکے دوستوں کے گروہ میں آوارہ قسم کی کچھ لڑکیاں بھی شامل ہوگئیں۔ جو اشرف کو غیبی خزانہ سمجھ کر اُسکی دولت پر عیش کرتی رہتی تھیں۔

ادھر اشرف کا باپ نالاں۔ اُسے اب احساس ہورہا تھا کہ اُسکی اولاد بگڑی ہوئی ہے وہ روپے کمانے کے بجائے کمائے ہوئے روپے بے دریغ خرچ کررہے ہیں۔ جو دبدبہ چودھری نے قائم کیا تھا وہ اسکے بیٹوں کی بُری کرتوت کیوجہ کم ہوتا جارہا تھا۔ اُسے فکر لاحق ہوگئی تھی۔ کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ جب اُسکی ساکھ بالکل ہی ختم ہوجائیگی۔ اور گروی رکھی ہوئی زمین کسان لوگ بغاوت کرکے واپس لے جائینگے۔ اور اُسے کنگال ہونا پڑے گا۔

دوسری طرف سلیم نے I.A.S کا پہلا امتحان پہلی پوزیشن میں پاس کیا۔ اور وہ اب فائینل کی تیاری میں لگ گیا۔ وہ دہلی میں ہی ایک فرم میں پارٹ ٹائم جاب کرر ہا تھا۔ اور اپنے خرچ کیلئے کمارہا تھا۔ اور اپنی پڑھائی جاری رکھے ہوئے تھا۔ تین سال کیسے بیتے۔ کچھ پتہ نہیں چلا۔ اور سلیم I.A.S آفیسر ہوگیا۔ وہ وادی لوٹ آیا۔ اور اپنے ہی ڈسٹرکٹ کا ڈپٹی کمشنر بن گیا۔ سب لوگ حیران اور بہت سارے خوش تھے کہ چلو اپنے گاؤں کا آدمی کمشنر بن گیا۔ ضرور اپنے لوگوں کی بھلائی کا کام کرے گا۔

سلیم نے سب سے پہلے اپنی گروی رکھی ہوئی زمین چھُڑالی۔ گاؤں تک

کی سڑک بننے لگی۔ پینے کیلئے صاف پانی کا بندوبست ہو گیا۔ کیونکہ ہفتہ گزرنے پر وہ اپنے گاؤں چھٹی گزارنے کیلئے آتا تھا۔ اس طرح متعلقہ محکمہ جات کے آفیسروں نے کمشنر صاحب کی تحصیل کے کام بغیر بتائے ہی کر دئے۔ اور اسطرح اس علاقے کے پچھڑے لوگوں کو راحت مل گئی کمشنر صاحب چونکہ اسی ضلع کا باشندہ تھا۔ پورے ضلع کی تعمیر و ترقی زور و شور سے ہونے لگی۔ خاص کر دور دراز پچھڑے علاقوں کا کام۔ کمشنری میں بغیر کسی رشوت کے فٹافٹ ہونے لگا۔ کسی کو شکایت کا موقعہ نہ ملتا تھا۔ اور ہر ایک کی زبان پر۔ ڈسی صاحب کیلئے تعریفی کلمات کیساتھ ساتھ دُعائیں بھی ہوتی تھیں۔

اور گاؤں کا چودھری ہر ایک سے کہتا پھرتا تھا۔ کہ واقعی حقیقی سرمایہ اچھی تعلیم و تربیت ہے۔ جس سے ہر رستہ کھل جاتا ہے۔ اور اس سرمایہ سے کنگال سے کنگال آدمی بھی مالا مال ہو جاتا ہے۔

امّاں بی

امّاں بی کو کون نہیں جانتا۔گاوں کے بچے۔بوڑھے۔جوان۔مرد اور عورتیں امّاں بی کے بن دام کے غلام تھے۔امّاں بی شفقت محبت اور مروت کا ایسا مجسمہ تھیں۔جسکا کام ہر ایک کی خدمت کرنا اور شفقت برتنا تھا۔گاوں میں ایسا کوئی گھر نہیں تھا۔جہاں امّاں بی نے دُکھ سُکھ میں اُنکا ساتھ نہ دیا ہو۔امّاں بی ایسا مرہم تھی۔جو ہر ایک کے زخم کا مداوا تھی۔ایسا فرشتہ تھی جسکا مقصد سب کی بھلائی تھا۔وہ بلالحاظ مذہب۔رنگ اور نسل کے۔امیر و غریب سب کے کام آتی۔

گاوں میں اگر کسی کی زچگی ہوتی اور اگر دایہ نہ ملتی امّاں بی یہ کام اچھی طرح سے انجام دیتی۔چھوٹا بڑا اگر کوئی بیمار ہوتا تو امّاں بی کے پاس آکر صلاح لیتا اور امّاں بی کے ٹوٹکے کام آتے۔ساس بہو کا جھگڑا ہوتا۔میاں بیوی میں اَن بن ہوتی۔ہمسائیوں میں آپس میں رنجش ہوتی۔امّاں بی سب کو آپس میں شیر و شکر کر دیتی۔اور اماں بی کے فیصلے کے سامنے کوئی چوں وچرا نہیں کرسکتا تھا۔جب وہ دس لوگوں کو کسی بھی معاملے میں اُلجھتے دیکھتی تو وہ اُن کو ایسے شیرین اور اچھے طریقے سے سمجھاتی کہ سب مُنہ تکتے رہ جاتے کہ سوجھ بوجھ کی اتنی وسعت اس ادھیڑ عمر

گاؤں کی ان پڑھ خاتون میں کہاں سے آ گئی۔ پنڈت لوگ مختلف مواقع پر اماّں بی کی کارکردگی کو سراہتے اور کہتے تھے کہ یہ اماّں بی۔ کبھی ماتا سرسوتی۔ کبھی دُرگا اور کبھی لکشمی ماتا کا روپ دھارن کرتی ہے۔

اماّں بی کی سب سے زیادہ قابل تعریف بات یہ تھی کہ 1947ء سے پہلے اُس نے اپنی بیٹیوں کو دو گاؤں دُور ایک سکول میں پڑھنے کیلئے بھیجا تھا۔ اور وہ گاؤں کے پنڈتوں اور مسلمانوں کو آمادہ کرتی رہتی تھی کہ وہ بچّوں کو سکول بھیجدیں۔ اُن دنوں پنڈت لوگ لڑکوں کو تو پڑھاتے تھے۔ مگر لڑکیوں کے پڑھنے کو بُرا سمجھتے تھے۔ وہ جاگیردارانہ ذہنیت کے مالک تھے اور لڑکیوں کو دوسرے گاؤں بھیجنا معیوب سمجھتے تھے۔

گاؤں کے مسلمان اگر مسجد کے مولوی صاحب کے پاس قرآن شریف پڑھنے کیلئے لڑکوں کو بھیجتے تھے۔ تو لڑکیوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کہ وہ قرآن شریف پڑھنے کیلئے جائیں۔ اور ایسے ماحول میں اماّں بی چٹان کی مانند ڈٹ گئی اور اپنی بیٹیوں کو سکول بھیجدیا۔ اور پھر ایک دن جب انگریز لیڈی سکول انسپکٹر کی سواری اس گاؤں سے گزری۔ جسکو دوسرے گاؤں کے سکول کا معائنہ کرنے جانا تھا تو اماں بی کو کسی طرح پتہ لگ گیا۔ وہ اسکی واپسی کا انتظار کرنے لگی اور گاؤں کے نمبردار سری کنٹھ کو بھی اپنے ساتھ لائی۔ اور ایک دوکاندار نندہ لال۔ گاؤں کے

چوکیدار غنی بٹ کو بھی اپنے ساتھ روکے رکھا۔ سکول انسپکٹر کی بھگی واپس آ گئی۔ تو امّاں بی نے اُس کو روکا۔ اور اپنے گاؤں کیلئے لڑکیوں کیلئے سکول کی مانگ کی۔ انسپکٹر نے کہا ''اپنا مطالبہ لکھ کر دو''

امّاں بی نے انسپکٹر کے کلرک سے ہی عرضی لکھوائی۔ نمبردار۔ چوکیدار کے دستخط کروائے۔ اپنا انگوٹھ لگوایا۔ اور پھر اگلے ہی مہینے گاؤں میں ایک گرلز پرائمیری سکول قایم ہوگیا۔ اور اکھنور کی ایک لیڈی ٹیچر بھی تعینات ہوگئی۔ بس پھر پورے گاؤں کی بچیاں چاہے ہندو تھیں یا مسلمان سکول آنے لگیں، پڑھنے کے ساتھ ساتھ، سلائی، کڑھائی اور بُنائی کا کام بھی سیکھنے لگیں۔ اور امّاں بی کو یک گونہ تسلی مل گئی۔

امّاں بی کو گاؤں والوں نے بغیر چُناو کے اپنا لیڈر چُن لیا تھا۔ وہ گاؤں کی بہبودی کیلئے جو قدم اُٹھانا چاہتی پورا گاؤں اسمیں شامل ہو جاتا تھا۔ اور سب کی سمجھ میں امّاں بی کی سمجھائی ہوئی بات آجاتی۔

پھر 1947ء کا سال آ گیا۔ ملک دو حصّوں میں بٹ گیا۔ امّاں بی کا گاؤں مہاراجہ ہری کی ریاست کا حصّہ تھا۔ اور یہ ہندوستان کیساتھ وابستہ ہوگیا۔ ملک کی سرحدیں بن گئیں۔ اور تقسیم ملک نے لوگوں کو خون کے دریا میں نہا دیا۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ لیکن امّاں بی کا گاؤں

پرسکون تھا۔

پھر اچانک ایک اور طوفان آ گیا۔ ہر طرف ایک ہی بات گونجتی تھی۔ قبائلی حملہ ہوا اور گاؤں کے ہندو خوفزدہ ہو گئے۔ اُنہیں اپنی جان و مال سے زیادہ اپنی عزت کی فکر لاحق ہو گئی۔ جس گھر میں جوان لڑکیاں تھیں۔ وہ کچھ زیادہ ہی گھبرا گئے۔ اور پھر نمبردار اماّں بی سے ملنے آیا دونوں نے مل کر مشورہ کیا۔ گاؤں کے سنجیدہ اور چیدہ چیدہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو بُلایا گیا۔ اور ہر حال میں امن اور بھائی چارہ قائم رکھنے کی بات کی گئی۔ ایک دوسرے پر اعتماد اور اعتبار برقرار رکھنے کی بات کی گئی۔ گیتا اور قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھائی گئیں کہ ہم ہر حال میں ایک ہیں اور ایک رہینگے۔

اُس وقت بھی اماّں بی چٹان کی مانند سینہ تان کر کھڑی ہو گئی۔ اور وہ اپنے ہندو ہمسایوں کی جوان بیٹیوں کیلئے آگے آئی۔ اپنے گھر کو اُنکے لئے ایک مضبوط قلعہ بنایا۔ اور خود پہرے دار بن گئی اور جب تک قبائلی حملے کی گونج رہی۔ اماّں بی کے گھر میں سرِشام اپنے ہمسایوں کی جوان بیٹیاں آکر بے فکر ہو کر سوتی رہتیں تھیں۔ اور اُنکے ماں باپ اپنے گھروں میں اطمینان کی نیند سوتے۔

پھر ایک رات عجیب بات ہو گئی۔ اماں بی اپنے مکان کی تیسری منزل پر کھڑکی میں بیٹھی تسبیح ہاتھ میں لئے اللہ کو یاد کر رہی تھی اور ایک طرح سے اپنے محلّے

کی چوکیداری بھی کر رہی تھی ۔ کہ باہر والی گلی جہاں ویدلال کی دوکان تھی ۔ وہاں گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز آئی ۔ اماں بی ٹوہ میں لگی ۔ اُسے بہت سارے گھوڑوں کے چلنے کی آوازیں آئیں پھر گولیاں چلیں ۔ دھائیں۔ دھائیں ۔ دھائیں۔ پھر دوکان کے کواڑ توڑنے کی آوازیں آئیں۔ اماں بی چونکہ جاگ رہی تھی ۔ پورا محلّہ بھی جاگ گیا۔ لیکن کسی میں یہ ہمت نہ تھی کہ ذرا باہر جھانک کر دیکھے۔ اماں بی کے مکان کے ساتھ ہی ایک ہاتھ کی دوری پر لکھمن جو کا مکان تھا۔ اماں بی نے دیکھا کہ لکھمن جو جاگ چکا ہے۔ لیکن خوف وحراس کے عالم میں گھر کی اوپری منزل میں ٹہل رہا ہے۔ اماں بی نے لکھمن جو کو آواز دی۔ جواب میں اُسکی خوف کے مارے ہکلائی ہوئی آواز آئی ۔اماں نے دوسرے ہمسائے ریشی میر کو آواز لگائی ۔ اُس نے بھی لرزتی آواز میں جواب دیا۔ اماں بی نے اُنکو اپنے ساتھ باہر چلنے کو کہا۔ لیکن نہ ریشی میر تیار ہوا نہ لکھمن جو۔

لکھمن جو قبائلی حملے کے پیش نظر خوفزدہ تھا۔ اور ریش میر نے اماں سے کہا اگر ہم باہر نکلیں گے تو ہوسکتا ہے اگر وہ قبائلی ہوئے تو مسلمان ہونے کے ناطے کہیں ہمیں یہ الزام نہ لگ جائے کہ ہم نے قبائلیوں کی مدد کی ۔ اماں بی کی چھٹی جس کہہ رہی تھی ۔ کہ یہ قبائلی نہیں ہیں ۔ بلکہ یہ چور ہیں ۔ اور اس وقت ویدلال کی جان خطرے میں ہے۔ لٹیرے اُسکا مال لوٹ رہے ہیں۔ لیکن اکیلی عورت ذات

رات کے سناٹے اور اندھیرے میں کہاں جاسکتی تھی۔ اُس نے چراغ جلایا چراغ کو ہاتھ میں لیکر باہر نکلی اور گلی میں زور کی آواز لگائی۔ لوگو خوف کے مارے اندر مت دُبکو یہ چور ہیں۔ باہر نکل آو۔ لوگوں کے دروازے دھڑا دھڑ کُھلنے لگے۔ لوگ لاٹھیاں۔ کُلہاڑیاں لئے باہر آگئے۔ لکھمن جو اور ریشی میر بھی باہر آگئے۔ لوگوں کا شور سُن کر چور چوکنے ہوگئے۔ اُنہوں نے جتنا مال گھوڑوں پر لادا تھا۔ اُتنا ہی لیکر گھوڑے دوڑاتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور بھاگتے بھاگتے ایک دو گولیاں پھر داغ دیں۔ تاکہ کوئی اُنکا پیچھا نہ کرے۔

اماں بی نے دوکان کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ دوکان دُور سے ہی خالی لگ رہی تھی۔ اماں بی لکھمن جو اور ریشی میر کو ساتھ لیکر وید لال کے گھر پہنچ گئی۔ گھر والے خوف کے مارے دُبکے پڑے تھے۔ امّاں بی نے آوازیں لگائیں۔ امّاں بی کی آواز سُن کر اُنکی جان میں جان آگئی۔ کھڑکی کھول کر پوچھا کیا بات ہے۔ امّاں بی نے کہا۔ وید لال کی دُکان میں چوری ہوگئی۔ آپ نمبردار کو باہر بھیجدو۔ نمبردار سری کنٹھ باہر آیا۔ اُسکے ساتھ اُسکا دوسرا بیٹا چونی لال بھی باہر آگیا۔ امّاں بی اُنکو ساتھ لیکر دوکان کے اندر چلی گئی۔ مال سب لُٹ چُکا تھا۔ وید لال اور اُسکے نوکر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ سری کنٹھ غش کھا کر گر پڑا۔ امّاں بی۔ لکھمن جو۔ ریشی میر ادھر اُدھر تلاش کرنے لگے۔ اُنہیں دوکان کے اندرونی طرف

اندھیرے کونے میں ایک بوری دکھائی دی ۔ امّاں بی بورے تک گئی ۔ بورے کو ہاتھ لگایا۔ کچھ عجیب سالگا۔ اُس نے چونی لال اور ریشی میر سے بوری کھولنے کیلئے کہا۔ بوری کھولی گئی ۔ اسمیں سے ویدلال ایک گٹھڑی ساہاتھ پاوں بندھے بے ہوش پڑا تھا۔ باہر نکال کر اُسکی رسیاں کھولیں ۔ سیدھا لٹایا مُنہ میں پانی ٹپکایا۔ تلوے اور ہاتھ سہلائے ۔ تب کہیں ہوش آیا۔ اور مُنہ سے چیخ نکل گئی ۔ پھر اُسکے نوکر کی تلاش شروع ہوگئی ۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ دوکان کے باہر بھی دیکھا۔ لیکن کہیں نظر نہیں آیا۔ امّاں بی دوکان سے باہر آئی ۔ اور سامنے ایک پتھر پر بیٹھ گئی ۔ اُسکے ہاتھ میں چراغ تھا۔ اور اس دھیمی روشنی میں اُسے دوکان کے تھڑے کے نیچے کچھ ہلتا ہوا نظر آیا۔ اُس نے ساتھیوں کو آواز دی ۔ اور تھڑے کے نیچے دیکھا تو ''گاشہ کاک'' کی لاش جیسی دکھائی دی ۔ باہر نکالا تو دیکھا اُسکے ہاتھ پاؤں بھی بندھے تھے ۔ مُنہ میں کپڑا ٹھوس کر اوپر کپڑا باندھا گیا تھا۔ مُنہ بند ہونے کی وجہ سے اُسکی آنکھیں جیسے باہر کو اُبل آئی تھیں ۔ دھیرے دھیرے اُسکو بھی ہوش میں لایا گیا۔

دونوں نے اپنی رام کہانی سُنائی ۔ اور بتادیا کہ یہ چور تھے جو اپنے ساتھ گھوڑے لیکر آئے تھے اور دُوکان لوٹ کر چلے ۔ علاقے میں ویدلال کی جیسی کسی کی دوکان نہیں تھی ۔ کریانہ اور بزازی سب لُٹ چُکا تھا۔

پولیس میں رپورٹ لکھوائی گئی ۔ کچھ ہی دونوں میں چوری کا مال برآمد

ہوا۔ جو مختلف گاؤں میں بیچا گیا تھا اور ہر ایک اماں بی کی بہادری اور بروقت کاروائی کے چرچے کرر ہا تھا۔ اُسکی بدولت دو آدمیوں کی جان بچ گئی علاقے کے تھانیدار اور تحصیل دار نے اماں بی کی بہت سراہنا کی۔ اگر آجکا دور ہوتا تو اماں بی کو راشٹرپتی کا میڈل ملتا۔ لیکن اُن دنوں یہ سب ممکن نہ تھا۔ صرف زبانی زبانی تعریفیں ہوئیں۔ اور وہ بھی اپنے علاقے میں۔

نظمیں

قلم ، تختی، سیاہی ، حرف ، کاغذ
میرے اندر کا بچپن کھو گیا ہے

زاہد مختار

اللہ کی حمد

ہاتھ اُٹھا کر کرو دُعائیں
جو کچھ مانگیں رب سے پائیں
جس نے ہمیں انسان بنایا
سب سے اعلیٰ و افضل بنایا
جس نے دیئے ماں باپ ہمارے
شفقت والے پیارے پیارے
جس نے پیاری دُنیا بنائی
رنگ برنگی خوب سجائی
تاروں سے آکاش سجایا
چاند اور سورج کو چمکایا

سورج سے گرمی اور روشنی پائی
قسم قسم کی فصل اُگ آئی
اُس نے دریا چشمے دئے ہیں
اُس نے پیڑ اور پودے دئے ہیں
اُس نے پہاڑ کھڑے کئے ہیں
جنگل اور بادل بھی دئے ہیں
اُسکی رحمت کے گُن گائیں
اُسکے آگے سب جُھک جائیں

☆☆☆
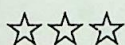
یہ کشمیر ہمارا ہے

یہ کشمیر ہمارا ہے۔جان سے بھی پیارا ہے
سب دیشوں سے نیارا ہے۔یہ کشمیر ہمارا ہے
جنگل ہیں پہاڑ ہیں ، برفیلے کوہسار ہیں
جلوے بے شمار ہیں ،جنت کا نظارا ہے

یہ کشمیر ہمارا ہے۔جان سے بھی پیارا ہے
جھیل ہیں۔چنار ہیں۔گرجتے آبشار ہیں
جھرنوں کے ستار ہیں۔نغموں نے پُکارا ہے

یہ کشمیر ہمارا ہے۔جان سے بھی پیارا ہے
پرندوں کی چہکار ہے۔خوشبوؤں کی مہکار ہے

باغ ہیں ۔ بہار ہے ۔کلیوں کا اشارا ہے
یہ کشمیر ہمارا ہے ۔جان سے بھی پیارا ہے

وادیاں دل لُبھاتی ہیں ۔ کھیتیاں لہلہاتی ہیں
ندیاں گیت گاتی ہیں پھولوں نے سنوارا ہے

یہ کشمیر ہمارا ہے ، جان سے بھی پیارا ہے
کیسر اور بادام ہیں ، سیب ، آڑو عام ہیں
میوؤں کے کتنے نام ہیں ، نورس کی دھارا ہے
یہ کشمیر ہمارا ہے ، جان سے بھی پیارا ہے

رشیوں ، مُنیوں کا ڈھیرا ہے پیارا سا بسیرا ہے
روشن اسکے رات اور دن دلکش شام وسویرا ہے
یہ کشمیر ہمارا ہے ، جان سے بھی پیارا ہے

عقلمند کوّا

بچّو پاس آو کہانی سنو
سُنا ہے جو میں نے وہ تم بھی سنو
کوّا ایک رہتا تھا بچّو جہاں
بہت زیادہ پانی نہیں تھا وہاں
کوئی ندّی ، نالہ نہ دریا تھا پاس
مُشکل سے ہر ایک بجُھاتا تھا پیاس
بہت گرمیاں تھیں مہینہ تھا جوُن
کہ گرمی کلیجے کو دیتی تھی بھُون
کوّا ایک پیاسا ادھر سے اُدھر
اُڑا پر کہیں پانی نہ آیا نظر

وہ تھک ہار بیٹھا جو اک باغ میں
کلیجہ جلے پیاس کی آگ میں
وہ مایوس تھا نیچے کی جو نظر
تو کونے میں مٹکا اک آیا نظر
خوشی سے وہ بلیّوں اچھلنے لگا
وہ کہتا تھا پانی مجھے مل گیا
وہ پھر پاس مٹکے کے پھُر سے گیا
مگر اسمیں پانی تھا کم رہ گیا
چُونچ اُسکی پانی کو چھو نا سکی
تھا پیاسا زبان اُسکی سوکھی رہی
مرے گرمی کے اُسکا بُرا حال تھا
اور پانی ملنا بھی محاّل تھا
اُداس ہوکے ڈالی پہ بیٹھا ہی تھا
ایکدم دماغ میں خیال آگیا

کچھ پتھر تھے چھوٹے مٹکے کے پاس
سمجھ آئی اسکو اِک ترکیب خاص

وہ ایک ایک پتھر اُٹھاتا گیا
اور مٹکے میں اُنکو گراتا گیا

جو مٹکے میں پتھر گرتے رہے
تو پانی کو اوپر کرتے رہے

یہاں تک کہ پہنچی کوسے کی چونچ
کام آئی اُسکو اپنی ہی سوچ

وہ پانی کو پی کر بہت خوش ہوا
ہوا تازہ دم اور پھر سے اُڑا

بچّو مُشکلوں سے نہ گھبرا وتم
کوسے کی طرح عقل آزماو تم

عقل سے ہو آسان تمہارا ہی کام
ہمت ہو تو روشن تمہارا ہو نام

چالاک بکری

اک بکری گھر سے نکل کر
چرنے نکلی جنگل کی راہ پر
چرتے چرتے کب رات آئی
پر وہ مستی میں نا سمجھ پائی
گھر کی جانب قدم اب اُٹھا نا
پُرخطر تھا یہ جو کھم اُٹھا نا
پاس دیکھا اور پھر دُور دیکھا
اپنے کو اُس نے مجبور دیکھا
تھا اندھیرا اور جنگل گھنا تھا
یوں بھٹکنا بھی ممکُن نہیں تھا
اسکے اندر خود کو چُھپانا
اپنے آپ تھا موت کو بُلانا

☆☆

بکری کٹیا کے اندر جو آئی

گھاس کے ڈھیر میں جان چھپائی

جلد ہی نیند نے اُسکو گھیرا

سوچا سوتے ہی ہوگا سویرا

نیند گہری تھی اِک شیر آیا

پاس کٹیا کے سُو نگھا، غُرایا

کُھل گئی نیند ، بکری تھرائی

اُس نے سوچا کہ اب موت آئی

شیر غرا کے ایسے دھاڑا

کون اندر ہے باہر نکل آ

ہوں میں دن بھر کا بھوکا پیاسا

لطف کھانے میں آئے ذرا سا

☆☆

سوچا بکری نے اب کیا کروں گی
بن لڑے ہی ، میں کیا مروں گی
کوئی تدبیر کرنی پڑے گی
شیر کو مات دینی پڑے گی
مرنے سے پہلے مرنا گناہ ہے
کوئی تدبیر کرنی روا ہے
بولی بکری میری بات سُن لے
جو صحیح ہے وہی راہ چُن لے
ہیں محافظ میرے یاں ڈٹ کر
کیسے نکلوں میں کٹیا سے باہر
تاک میں ہیں تیری لوٹ جاؤ
موت کو خود نہ اپنی بُلاو
یوں کھڑا ہے میرا سینگ والا
یہ تُجھے مارے گا لا محالہ
پیٹ میں سینگ جسکے وہ گاڑھے
اُسکی حالت کو ایکدم بگاڑے

آ نتیں باہر نکالے گا اُسکی
اُس سے اُلجھے جو شامت ہے اُسکی
مت خلیلے کی تم بات پوچھو
کھال اُتری تمہاری یہ سمجھو
خون پی لے گا پانی سمجھ کر
چوس ڈالے گا گُٹھلی سمجھ کر
یہ رہے میرے مومن وعثمان
ایک کر دینگے دھرتی وآسمان
دونوں مل کر تجھے پھاڑ دینگے
تجھ کو زندہ ہی وہ گاڑھ دینگے
سُن کے بکری کی باتیں وہ سہما
دُم دبا کر ہی پھر شیر بھاگا
عقل سے کام بکری نے لیکر
مات دی شیر کو اُس نے ڈٹ کر
عقل اور حوصلے کی بدولت
پائی پھر سے جیون کی دولت

سونُو کی بلّی

سونُو نے اِک بلّی پالی
بلّی کیا تھی بڑی نرالی
بھوری رنگت دھاری والی
نیلی نیلی آنکھوں والی
ریشم جیسی کھال ہے اُسکی
شہزادی سی چال ہے اُسکی
دبے قدموں چلنے والی
صورت اُسکی بھولی بھالی
میاؤں میاؤں کی بولی بولے
کانوں میں میٹھا رس گھولے
روٹی ، دُودھ پہ پلنے والی
گوشت کی خاطر لڑنے والی

گوشت ملے چٹ کر ہے جاتی
چوہوں کو ہے پکڑ کے کھاتی
کھاپی کر کونے میں جاتی
یا پھر صوفے پر سوجاتی
پیڑوں پر وہ چڑھ جاتی ہے
چڑیوں کے بچے کھاتی ہے
کُتے سے وہ ڈر جاتی ہے
کمرے میں وہ چھپ جاتی ہے
بلّی کی اک صفت ہے اچھی
گھر کو گندہ نہیں وہ کرتی
خود بھی صاف اور ستھری رہتی
تب ہی سب کو وہ اچھی لگتی

☆☆☆
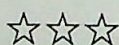
شیر اور چُوہا

ایک جنگل میں تھا شیر سویا
خواب کی وادیوں میں تھا کھویا
نکلا چھوٹا سا چوہا بل سے
گا رہا تھا وہ مستی میں دل سے
خوب مستی کے عالم میں نکلا
شیر پر چڑھ کے کودا اور اُچھلا

☆☆☆
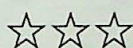
شیر جاگا اور خوب اکڑا
اپنے پنجے میں چوہے کو پکڑا
اور غصّے میں چوہے پہ گرجا
نامُراد میرے ہاتھوں ہی مرجا

چوہا تھرایا جان اُسکی نکلی
روتے روتے بندھی اسکی ہچکی

☆☆☆

عرض کی اور لرز کر یہ بولا
میرے راجا میں ہوں چھوٹاسا چوہا
مجھ کو کھا کر تجھے کیا ملے گا
اک نوالہ ہوں کام نہ چلے گا
گر حضّو ر مجھ کو آزاد کردیں
ہم بھی دم دوستی کا بھر دیں

☆☆☆

دوستی شیر کی اور ''تم'' سے
مُنہ سنبھالو کرو بات ہم سے
لومیں آزاد کرتا ہوں تم کو
پھر نہ تکلیف دینا تو ہم کو

جان میں جان چوہے کی آئی
دُم دبایا اور بل کی راہ لی
کُچھ دنوں بعد آیا شکاری
جال پھیلایا اُس نے تھا بھاری
بے خیالی میں جنگل کا راجا
تھا نہ احساس اُسکو ذرا سا
پھنس گیا جال میں وہ بیچارا
وہ مدد کیلئے اب پُکارا

☆☆☆

کوئی ہے جو میری جان بچائے
مجھ کو اس جال سے جو چُھڑائے
بل سے نکلا پُھدکتا وہ چوہا
شیر کو جال میں اُس نے دیکھا
بولا غم مت کرو میرے بھائی
میں دلاؤں گا تم کو رہائی

دھیرے دھیرے لگا جال کترنے
شیر کا دم لگا کچھ سنبھلے
کُترا جب جال سارا تو بولا
اب نکل آو موقعہ ہے اچھا
شیر کو مل گئی جب رہائی
بات اُسکی سمجھ میں آئی
کوئی چھوٹا بڑا یاں نہیں ہے
جو بھلا ہے بڑا بس وہی ہے
کام اک دوسرے کے جو آئے
کر بھلائی، بھلائی ہی پائے

تتلی

تتلی باغ کی رانی ہے
تتلی بڑی سیانی ہے
رنگ برنگے پروں والی
اُڑتی پھرتی ڈالی ڈالی
پھولوں پر منڈلاتی ہے
رس لے کر اُڑ جاتی ہے
تتلی جب زرِگل لے جائے
پھولو ں کے اندر پھیلا ئے
پھلوں کی بہتات ہو جائے
باغبان کی بات ہو جائے
جو بھی چیز اللہ نے بنائی
جگ میں اِنسان کے کام آئی

نٹ کھٹ اَبدال

ابدال نٹ کھٹ من کا سچا
عمر کا چھوٹا عقل کا کچا
توتلی باتیں کرنے والا
موہنی صورت بھولا بھالا
دادی ، دادا کی آنکھ کا تارا
نانا ، نانی کا راج دُلارا
سدا ہنستے رہنے والا
شرارتوں میں رہنے والا
بستہ گلے میں ڈالے رہتا

بچوں کے سنگ سکول ہے جاتا
جو سُنتا ہے یاد ہے رکھتا
چپکے چپکے ہے دھراتا
چھڑی ہاتھ میں لئے پھرتا
کسکو ماروں کہتا رہتا
جب بھی وہ ہے موقعہ پاتا
کسی نہ کسی کو مار ہے آتا
بہنا سے وہ پیار ہے کرتا
پھر بھی اُسکے بال پکڑتا
اُس کو رُلا کے دُکھی ہوجاتا
پیار سے چُوم کے اُسے مناتا
جوتے ، چپل مُنہ میں ڈالے
کاغذ ملے تو خوب چبالے

اچھا بُرا وہ کیا جانے
اپنی ضد کو اچھّا جانے
جتنے کھِلونے سب توڑ ڈالے
اپنے بھی اور بھیّا والے
سب بچوں سے گھل مل جاتا
لیڈری خوب ہے وہ چمکاتا
سب کو پیچھے گھمانے والا
تگڑی کا ناچ نچانے والا
تھانے داری خوب کریگا
سب کو راہ پہ لے آئیگا
بڑے جتن سے ہمیں ملا ہے
اللہ سے مانگی وہ دُعا ہے
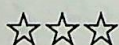
جنیّا

ایک ہے جنیّا تتلی جیسی
ہلکی پھلکی نازک کلی سی
پیاری پیاری صورت والی
من موہنی اور بھولی بھالی
گھر میں سب کی پیاری ہے وہ
جیسے راج دلاری ہے وہ
دادی کے سنگ رہنے والی
کام میں آگے آنے والی
چھوٹی ہے پر نہیں وہ ڈرتی
جو کام بولو دوڑ کے کرتی

اندھیرے سے ڈرتی نہیں ہے
ٹارچ لیکے چل پڑتی ہے
بابا کی نانی ہے بنتی
سر سہلاتی پیار ہے کرتی
گھر میں جو بھی چیز ہے پاتی
بابا کو کھِلا کے خوش ہو جاتی
ہمت سے کوشش ہے کرتی
ماں کے چھوٹے کام ہے کرتی
بھائی جو بھی چیز بگاڑے
اُسکو ڈانٹے اور خود سنوارے
بیٹی اللہ کا تحفہ ہے
خوش قسمت وہ جسکو ملا ہے

☆☆☆

عقلمند بکری

ایک گاؤں تھا دریا کنارے
پیارے پیارے تھے اسکے نظارے
خوبصورت تھے کھیت اور میدان
لہلہاتے تھے سارے کے سارے
پھول بکھرے تھے میدان میں ایسے
جیسے آکاش میں ہوں ستارے
چرنے جاتے تھے میدان میں جانور
ہوتے رہتے تھے وارے نیارے

☆☆☆

گاؤں کے بیچ پیاری سی ندیا
جس کے اوپر تھی چھوٹی سی پُلیا
پر وہ پُلیا تھی اتنی ہی چوڑی
جس پہ گزرے بس اک بکری
ایک دن کی ہے یہ بات بچّو
عقل کی بات ہے گر یہ سمجھو

☆☆☆

اک بکری چلی جوں ہی اِس پار سے
دُوسری آئی پُلیا کے اُس پار سے
بیچ پُلیا کے دونوں جب آگئیں
پار کیسے ہم اُتریں یہ کہنے لگیں
آگے پیچھے بھی جانا ممکن نہ تھا
ساتھ ساتھ پار کرنا یہ ممکن نہ تھا
ایک بکری بڑی ہی سمجھدار تھی

دوسری کو وہ یہ بات سمجھا گئی

وقت ضایع نہ ہو تیرا میرا

گھر چلیں ہونے آیا اندھیرا

ایسے کب تک رُکے ہی رہینگے

گر کے ڈوبے ینگے اور پھر مرینگے

☆☆☆
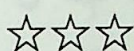
پُل پہ بیٹھوں گی تم آتو جاؤ

میرے اُوپر سے تم کُود جاؤ

بکری کودی اُس پار پہنچی

دُوسری اُٹھ کے اس پار پہنچی

جو سمجھ بُوجھ سے کام لے گا

وہ کبھی بھی نہ برباد ہوگا

بگڑے بن جائینگے کام اُنکے

اُونچے ہو جائینگے نام اُنکے

☆☆☆

خدایا ، پھر مجھے بچہّ بنا دے......

بچوں کے ساتھ چند لمحے گزارنے کا ایک ایسا عمل جو لگ بھگ ہر ایک کی زندگی میں اپنا ایک تاثر ، اپنی ایک ان مٹ چھاپ چھوڑ دیتا ہے اس بات کا غماز بھی ہے کہ انسان بنیادی طور پر اپنی زندگی کے کسی بھی پڑاؤ پر کسی بھی بچے میں خود کو تلاش کرتا ہے یا خود کو محسوس کرتا ہے۔

بچپنا بھلے ہی چھوڑ کے چلا جاتا ہے لیکن بچپن ہر پل جیسے دامن تھامے یا اُنگلی پکڑے ساتھ ساتھ چلنے کی ضد کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور شاید.................

..................اسی ضد کو حمیدہ جی نے پورا کرنے کی کوشش کی ہے، ایک معصوم لفظوں بھری کوشش جس میں بناوٹ کا رنگ نہیں، تکرار و حجت کا احساس نہیں بس ایک بچے کی خوبصورت سی شرارت۔ حسین سی مسکراہٹ، نٹ کھٹ سی کوئی ادا، اور بیساختہ سی کوئی انجانی سی خطا محسوس

ہوتی ہے اور اس کے ہر پہلو میں ایک دلکشی کا احساس اپنے تمام رنگ بکھیرتے ہوئے نظر آتا ہے۔

ایسی تحریروں کو نقاد کی نظر بھی شاید تیر و نشتر بھری نگاہ سے دیکھنے کے بجائے شفقت، محبت اور اپنائیت سے دیکھنے کی تمنا کرے گی اور میرا یہ ماننا ہے کہ تمنا کا حسن و قبیح نہیں دیکھا جاتا۔ تمنا، تمنا ہے اور حمیدہ جی کی یہ تمنا کہ وہ لکھے اور اچھا لکھے، خدا کرے ہر لمحے اور حسین تر اور خوب تر ہو۔

اول مارچ ۲۰۱۴ء

زاهد مختار

مدیر اعلیٰ

ماہنامہ 'لفظ لفظ''

اسلام آباد کشمیر

almukhtar publications Islamabad KMR

SABQ SABQ KAHANI

Hameeda Shah Akhter